قلندر بولتا ہے

سلیم صدیقی

غزل نہایت سخت جان صنف سخن ہے۔ ادھر تو جو اٹھتا ہے اس کو روندتا ہوا اٹھتا ہے۔ بالعموم لوگوں کو اس کا اندازہ ہی نہیں کہ یہ جتنی آسان نظر آتی ہے اتنی ہی دقت طلب اور مشکل بھی ہے، بلکہ غزل مشکل سے بھی مشکل صنف سخن ہے۔ اس کا سب سے بڑا چیلنج بیک وقت روایت سے جڑے رہنے اور روایت سے ہٹ کر چلنے میں ہے۔ غزل میں ندرت اور تازہ کاری نہیں تو وہ شعر ہی نہیں، نری مشقِ سخن ہے۔ پھر اس میں واقعیت سے بات نہیں بنتی، اس کی گرامر، ایمائیت اور اشاریت کی زبان بولتی ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ نوجوان شاعر سلیم صدیقی اس زبان کو سمجھتے ہیں اور غزل کے آداب اور رکھ رکھاؤ سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ دہلی کے بزرگ اور معتبر شاعر وقار مانوی سے انھیں شرف تلمذ حاصل رہا ہے، لہٰذا ان کی تربیت کا یہ اثر ہے کہ سلیم کے یہاں ایک پختہ اور پاکیزہ شعری شعور ملتا ہے۔ وہ اپنے نانا قاضی تفضّل حسین سخی سے جو حمد و نعت کے معروف شاعر تھے، بھی شعری نسبت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں شائستگی اور لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ دو تین دہائیوں سے صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ سے ان کی وابستگی نے انھیں دہلی میں متعارف کرایا۔ وہ اچھے صحافی تو ہیں ہی، ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ وہ خاص دہلی والے ہیں اور دہلی کی شعری فضا میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ آج کی نئی نسل سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور ان میں سلیم صدیقی بھی شامل ہیں۔ دعا گو ہوں کہ ان کے اولین شعری مجموعہ ’قلندر بولتا ہے‘ کو ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ
پروفیسر ایمریٹس، دہلی یونیورسٹی
سابق صدر ساہتیہ اکیڈمی

قلندر بولتا ہے

سلیم صدیقی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : قلندر بولتا ہے
نام شاعر : قاضی سلیم احمد صدیقی
قلمی نام : سلیم صدیقی
ناشر : ایمن پبلی کیشنز، دہلی
زیر اہتمام : ڈاکٹر منور حسن کمال
صفحات : 264
قیمت : 250 روپے
سنہ اشاعت : 2012
تعداد : 400
پتہ : 5320 کوچہ رحمٰن چاندنی چوک دہلی۔ 6
Email : salimsiddiqui1962@gmail.com
کمپوزنگ : آرزو کمپیوٹر
طباعت : رُشن پرنٹرس، چوڑی والان، دہلی۔ 6
تقسیم کار : یونیک پبلیشرس، 3072/30 پہلی منزل، گولا مارکیٹ،
پرتاپ اسٹریٹ دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002
مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

U
891
S12Q-1

انتساب

اپنی پیاری ’امّی‘

محترمہ نعیم فاطمہ المعروف شاعرہ بی (مرحومہ)

اور

والد محترم

جناب قاضی شمیم احمد صدیقی (مرحوم)

کے نام

جن کی قابل قدر آغوش و تربیت نے مجھے

انسانیت، خلوص، ایثار، خودداری اور حق بیانی

کی دولت سے مالا مال کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

----کچھ اپنے بارے میں

ایک قلم کار کے لئے اپنے بارے میں کچھ لکھنا سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے، چونکہ اب یہ روایت بن چکی ہے کہ کتاب کی اشاعت کے وقت قلم کار کو اپنا تعارف خود پیش کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس کام کو انجام دینا ایک مجبوری ہے اور ایک صحافی ہونے کے باوجود میرے لئے یہ انتہائی مشکل کام ہے۔ کہاں سے اور کیسے شروع کیا جائے یہ بھی ایک پریشان کن بات ہے۔ بہرحال شروعات یہاں سے کی جائے کہ میری پیدائش اتر پردیش کے شہر بریلی میں ایک متوسط مگر معزز گھرانے میں 3 جنوری 1962 کو ہوئی۔ میرا ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ شاعری مجھے وراثت میں ملی۔ میری معلومات کے مطابق میرے خاندان میں کوئی بہت بڑا شاعر یا ادیب بھی نہیں گزرا سوائے میرے نانا جان قاضی تفضّل حسین مرحوم کے، جو 'نخی بریلوی' تخلص فرماتے تھے اور حمد و نعت کے شاعر تھے، لیکن ان کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب میری عمر محض تین سال تھی۔ اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری شاعری وراثت کا نہیں بلکہ صحبت اور حالات کا نتیجہ ہے۔

جب میری عمر چار سال تھی تب میرے والدین مستقل طور پر بریلی سے دہلی منتقل ہو گئے جہاں کوچہ رحمٰن چاندنی چوک میں پہلے سے ہی میرے دادا قاضی طفیل احمد صدیقی اور چچا وغیرہ سکونت پذیر تھے۔ میری ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ اپنے شفیق چچا جان قاضی فہیم احمد صدیقی سے اردو اور ریاضی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میں نے میر، غالب، ذوق اور داغ کے دیار میں ہوش سنبھالا۔ میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں میں پہلی بار شاعری سے روشناس اور لطف اندوز ہوا وہ جگہ 'کوچہ استاد داغ' تھی۔ ہمارا کنبہ کوچہ رحمٰن چاندنی چوک میں

رہتا تھا اور میرے والد قاضی شمیم احمد صدیقی اور چچا صاحب قاضی شکیل احمد صدیقی دونوں کوچہ استاد داغ میں کڑھائی کا کام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ آج کے معروف استاد شاعر نصرت گوالیاری بھی کام کرتے تھے، جو میری شاعری کے محرک بنے۔ ان کے شعر سن کر دل و دماغ شاعری کی جانب راغب ہوا۔ اس وقت میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ جب میں پانچویں جماعت میں تھا تب ایک دن اچانک میری زندگی کے سب سے پہلے دوست محمد صالحین (جو بعد میں صالحین فہمی کے نام سے مشہور شاعر ہوئے) نے بتایا کہ لال قلعہ میں کوئی پروگرام ہو رہا ہے جہاں گانے گائے جائیں گے۔ ہم دونوں نے مل کر فوراً ہی منصوبہ بنایا اور شام ہوتے ہی لال قلعہ پہنچ گئے اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر اندر داخل ہو گئے۔ اصل میں یہ پروگرام کچھ اور نہیں بلکہ لال قلعہ کا مشہور 'مشاعرہ جشن جمہوریت' تھا۔ صالحین اور میں نے پہلی بار مشاعرہ دیکھا اور سنا، لیکن گھر والوں کے خوف سے جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ اس کے بعد جب بھی کہیں کوئی مشاعرہ ہوتا اور ہمیں خبر مل جاتی تو ہم کچھ دیر کے لئے ہی سہی، شرکت ضرور کرتے اور اس کے لئے گھر والوں سے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور بنانا پڑتا تھا۔ بہانے بنانے میں صالحین اور میں ایک دوسرے کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے کئی بار مار بھی کھانی پڑی۔

1969 میں گھریلو پریشانیوں کے باعث میرے والدین مشرقی دہلی کے جعفر آباد میں منتقل ہو گئے، لیکن میں 1971 تک اپنے دادا اور چچا کے ساتھ کوچہ رحمٰن میں ہی رہا۔ اس کے بعد مجھے بھی والدین کے پاس جعفر آباد جانا پڑا۔ بد قسمتی سے وہاں جس اسکول میں داخلہ ملا وہاں اردو بطور مضمون بھی نہیں تھی۔ یعنی اسکولی سطح پر اردو کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہا جس کا ملال مجھے آج تک ہے کیونکہ شاعری کے اپنے شوق کو جلا بخشنے کے لئے اپنی کوشش اور کاوش سے جتنی اردو

سیکھ یا پڑھ پایا وہ ناکافی تھی۔ اردو کے تعلق سے اپنی کم فہمی و تنگ دستی کا مجھے شدت سے احساس تھا اور آج بھی ہے، حالانکہ بعد میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر کا امتحان پاس کیا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بعد میں بطور روزگار اردو صحافت کو منتخب کیا اور آج تک اسی پیشے سے وابستہ ہوں۔ میں نے پہلی غزل 1976 میں موزوں کی اور 1977 میں اپنے اسکول میں منعقد ایک تقریب میں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ 1978 میں جناب سید شبّر مرتضیٰ نقوی انقلاب سرسوی سے باقاعدہ اصلاح لینی شروع کی اور 1979 میں پہلی بار میری غزل دہلی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ ‘پرتاپ’ میں شائع ہوئی اور اسی سال میں نے پہلی بار مشرقی دہلی کی معروف ادب نواز شخصیت حاجی ظہیر مرزا کی رہائش گاہ پر ایک شعری نشست میں بطور شاعر شرکت کی۔ میں تقریباً آٹھ سال تک انقلاب سرسوی صاحب سے اصلاح لیتا رہا، لیکن ان کے پاس وقت کی کمی کے باعث اکثر اپنے محترم دوست عبدالحمید ندیم دہلوی سے (جنہیں میں نے ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا) مشورۂ سخن کرتا رہا۔ 1989 میں جناب انقلاب سرسوی اور جناب شہباز ندیم ضیائی کے مشورہ پر دہلی کے ماہر فن استاد شاعر حضرت محمد ظہیر خان وقار مانوی کے حلقہ تلمذہ میں شامل ہوگیا اور آج تک آپ کی سرپرستی میں سلسلہ ‘مشقِ سخن’ جاری ہے۔ جناب وقار مانوی صاحب انتہائی شفیق، محبت کرنے والے اور پرخلوص انسان ہیں جو کبھی نہ تو کسی صلے کی پروا کرتے ہیں اور نہ ہی اس پرآشوب دور کے خودساختہ اساتذہ کی طرح شاگردوں سے کوئی مطالبہ کرتے ہیں۔ وقار صاحب کی اپنی ایک قلندرانہ شان ہے اور ان کے علم و فن کا ایک زمانہ معترف ہے۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں ان کا شاگرد ہوں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں میرے والدین کی

دعائیں‘ میرے استاد محترم کا دست شفقت، میری شریک حیات کا تعاون اور میرے دوستوں کی حوصلہ افزائی کا اہم رول ہے۔ میرے والد قاضی شمیم احمد صدیقی مرحوم جنہیں ہم ’بابو‘ کہہ کر پکارتے تھے، حالانکہ میرے شاعر بننے سے خوش نہیں تھے، لیکن انہوں نے اپنی خاموش منظوری دے دی تھی اور بعد میں وہ خود اکثر مشاعروں میں سامعین کی صفوں میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ میری قابل احترام ’امّی‘ شاعری اور ادب کی دلدادہ تھیں۔ ادب سے لگاؤ انہیں میرے نانا جان سے ورثہ میں ملا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میری والدہ کا حقیقی نام نعیم فاطمہ تھا، لیکن میرے نانا جان انہیں ’شاعرہ بی‘ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد میری امّی زندگی بھر ’شاعرہ بی‘ کے نام سے ہی پکاری جاتی رہیں۔ شادی کے بعد اکثر شاعری کے شوق اور مشاعروں میں شرکت کرنے میں بیویاں رخنہ اندازی کرتی ہیں لیکن میرے لئے یہ بھی خوش قسمتی کی بات رہی کہ میری شریک حیات ثمر جہاں کو عام روایتی بیویوں کی طرح شاعری اور مشاعروں سے کبھی الرجی نہیں رہی، بلکہ وہ خود مشاعرے سننے کی ہمیشہ متمنی رہی ہیں۔ اس موقع پر اگر میں اپنی پیاری پیاری بیٹیوں ’ایمن‘ اور ’انوشہ‘ کا ذکر نہ کروں تو یہ مضمون ہی نامکمل رہے گا کیونکہ اپنی ان دونوں لاڈلی بیٹیوں کے بغیر تو میں بھی نامکمل ہوں اور میری زندگی بھی۔ میری دونوں بیٹیاں شعر و شاعری کی دلدادہ ہیں اور اپنے پاپا کو کلام پڑھتے دیکھ ان کے چہرے خوشی سے چمکنے لگتے ہیں۔ میرے دونوں بھتیجے محمد اظہر الدین اور محمد اطہر الدین مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے انتہائی فرماں بردار بھائی نعیم احمد صدیقی اور وسیم احمد صدیقی اور بے لوث محبت کرنے والی بہنیں زہرا جمال (بڑی) فرحت جہاں اور فیروزہ جمال عطا کیں۔ اس موقع پر اپنے شفیق ’چچا جان‘ قاضی فہیم احمد صدیقی اور ’چچا صاحب‘ قاضی شکیل احمد صدیقی کا ذکر کرنا چاہوں گا، جواب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میرے چچا

جان کا میری شخصیت پر بہت گہرا اثر رہا۔ وہی میرے اول استاد تھے جنہوں نے مجھے اردو اور ریاضی کی ابتدائی تعلیم دی۔ ان کے علاوہ 'چچا صاحب' مرحوم انتہائی محبت کرنے والے اور بھتیجی بھتیجوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے والوں میں تھے۔ یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ انہیں نوجوانی میں ہی شوگر جیسی لاعلاج بیماری نے آلیا اور محض 34-35 سال کی عمر میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ میں اپنے ان دونوں چچاؤں کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اللہ انکی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

میرا پہلا شعری مجموعہ ''قلندر بولتا ہے'' آپ کے روبرو ہے۔ میں اپنی کوشش اور کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ اگر اس شعری مجموعہ میں شامل ایک شعر بھی آپ کو پسند آگیا یا زندہ رہ گیا، وہی میری سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ میرے اس شعری مجموعہ پر جن اہل قلم و ناقدین نے اپنی قیمتی آراء تحریر کیں، میں ان سب کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اس موقع پر میں خاص طور سے اپنے استاد محترم حضرت وقار مانوی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری سرپرستی فرمائی۔ شعری مجموعہ کے انتخاب اور ترتیب کے لئے میں جناب شمس رمزی اور سرورق کے لئے اپنے ہم زلف اور معروف آرٹسٹ محمد شعیب صاحب کا شکرگزار ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے محترم دوست عبدالحمید ندیم دہلوی (مرحوم)، صالحین فہمی (مرحوم)، انور باری (مرحوم) محمد ظفیر مرزا (مرحوم)، سید نجیب حسن جعفری اور انجم رحمانی (مرحوم) کو خاص طور پر یاد کرنا چاہوں گا جنہوں نے شاعری کے ابتدائی دور میں میری قابل قدر حوصلہ افزائی کی۔

سلیم صدیقی

احوال واقعی

وقار مانوی

عزیزی سلیم صدیقی کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے فقط میں ہی نہیں ان کے بہت سے احباب بھی ان سے ان کے کلام کی اشاعت کا تقاضا کرتے رہے ہیں، لیکن سلیم صدیقی اپنے ذوق شعری کو ہمیشہ ثانوی درجہ دے کر اپنی گھریلو ذمہ داری اور ملازمت کے فرائض منصبی کی ادائیگی کو اولیت دیتے رہے ہیں اور اسی میں زیادہ مصروف رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ونمود اور شہرت سے دلچسپی نہیں رکھتے، اس لئے اس کام میں تاخیر ہوتی رہی ورنہ ان کے کلام کی اشاعت بہت پہلے ہوسکتی تھی۔ بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کے احباب کا اصرار ان کو اس منزل تک لے آیا ہے کہ وہ اپنے کلام کی اشاعت وطباعت کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ ’’قلندر بولتا ہے‘‘ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ان کی تیس سالہ کاوشوں کا حاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔

ان کی شاعری کے بارے میں زیادہ نہیں تو اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ حالات زمانہ کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ سادہ سلیس اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام کی خوبی یہی ہے کہ نہ مضامین ادق ہوتے ہیں نہ ان کا لہجہ ثقیل ہے۔ ان کے بیان میں سلاست اور روانی نمایاں ہے۔ کلام میں کسی طرح کی کج روی یا ناہمواری نظر نہیں آتی۔ مفہوم شعر کو قاری تک پہنچانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک ایسی صاف ستھری شاعری قبول عام کی راہ

کھولتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادبی محفلوں میں خاصے مقبول ہیں۔ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، توجہ سے سنا جاتا ہے۔ جہاں تک ان کی ذاتی صفات کا سوال ہے یہ خوش مزاج ہیں، ملنسار ہیں، ہمدردی ان کا شعار ہے۔ اپنے ہم عصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بڑوں کا احترام کرتے ہیں چھوٹوں سے شفقت رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کی زندگی صحافت سے وابستہ ہے، سیاسی اور سماجی حالات پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔ حالات زمانہ سے خود بھی باخبر رہتے ہیں اور ماحول کو بھی باخبر رکھنے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ پیش آنے والے حالات کی ترجمانی بھی شگفتہ اور ستھرے انداز میں کر گزرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری تازہ کاری اور تاثیر کی آئینہ دار ہے۔

ان کی موجودہ ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ دنیائے ادب میں مزید ترقی سے ہمکنار ہوں گے۔ ''قلندر بولتا ہے'' کو ادبی حلقوں میں پذیرائی ملے، اسے سراہا جائے اس کے لئے میں متمنی بھی ہوں اور دعا گو بھی۔

✻

سلیم صدیقی ابہام کے قائل نہیں

پروفیسر اختر الواسع
وائس چیئرمین: اردو اکادمی، دھلی
ڈائریکٹر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
صدر: اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دھلی

صحافت اور شاعری دونوں حوالوں سے سلیم صدیقی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ صحافت کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ متعین وقت پر کاغذ سیاہ کرنا پڑتا ہی ہے البتہ شاعری ایک خود مکتفی ادارہ ہے۔ یہاں فن کار کو اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے پوری آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی کا فائدہ اٹھا کر وہ اپنے ادبی و شعری تجربے کو باوقار بنا سکتا ہے۔ سلیم صدیقی ان دونوں حدود سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اپنی حد تک ان کے واجبات ادا کرنے کی سعیِ مشکور بھی کی ہے۔

سلیم صدیقی دہلی کی ادبی و شعری سرگرمیوں کے ساتھ پروان چڑھے۔ آج سے تین چار دہائی قبل دلی کا ادبی منظر نامہ خاصا روشن اور تابناک تھا، اس وقت ہونے والے علمی مذاکروں سے نہ صرف بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا بلکہ یہ تربیت کا ایک اہم ادارہ بھی تصور کیے جاتے تھے۔ وہ دور بھی کیا خوب تھا، لوگ زبان اور محاوروں کے درست استعمال کے لیے لڑتے تھے۔ لفظ کے

صحیح استعمال کے لیے لغات اور کلاسیکی ادبیات سے مثالیں لائی جاتی تھیں۔ ایسے زمانے میں شعر و شاعری کوئی مسئلہ نہیں تھی، کم و بیش ہر شخص موزوں طبع ہوا کرتا تھا۔ بذلہ سنجی، سخن فہمی اور سخن سنجی ہمارے بزرگوں کا قابل فخر کارنامہ رہا ہے، مگر آج کے زمانے میں جب کہ ٹکنالوجی اور مشینی کلچر نے پوری کائنات کو قابو میں کر رکھا ہے۔ شعر و ادب ایک دشوار کن چیز بن گئی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ تو گئے زمانے کی کوئی چیز ہے آج اس کی کیا ضرورت ہے۔ شاعری لطف و انبساط سے آج بھی خالی نہیں، مگر اس کے شیدائیوں میں رفتہ رفتہ کمی آ رہی ہے۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں شاعری کا چراغ روشن کرنا ہی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے لیے میں سلیم صدیقی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

''قلندر بولتا ہے'' کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ فن کار نہ صرف اظہار بیان پر قادر ہے بلکہ اسے جو کچھ کہنا ہے، جن جذبات کا اظہار کرنا ہے وہ اسے نہایت سلیقے کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ فن کار سماجی رویوں اور قدروں میں آنے والی تبدیلیوں پر بھی مختلف انداز میں اظہار کر رہا ہے۔ اس کا احساس یہی ہے کہ نئی قدروں نے یقیناً زندگی کے کچھ نئے زاویے ضرور روشن کیے ہیں مگر اس کے نتیجے میں ہم ان قدروں سے دور ہوتے جا رہے ہیں جو ہمارا سرمایہ افتخار تھیں اور یہی چیز فن کار کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ اس نوع کے بے شمار اشعار سلیم کے یہاں ملیں گے۔ اسی کے ساتھ رشتوں خصوصاً ماں، بیٹی، بھائی اور دیگر قریبی اعزہ جن کی باہمی اخوت اور محبت کسی گھر کو جنت نما بناتی ہے، اب اس طرح کے رشتوں میں پیدا ہونے والے انتشار پر تخلیق کار ماتم کناں ہے۔ وہ خلوص و محبت کی اس دنیا کا متلاشی، ہے جہاں اس کے بدلے جاں کا نذرانہ بھی معمولی چیز ہوا کرتی ہے۔ گویا سلیم صدیقی کا شعری کینوس مشرقی تہذیب و اقدار

کا ایک ایسا نگار خانہ ہے، جس میں ہم اپنی تہذیبی زندگی کے بہت سے بنتے بگڑتے خاکے دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے سلیم صدیقی کے بعض راست انداز کے شعروں پر کسی کو تردد ہو، مگر ایسا نہیں ہے کہ ان سے پہلے اس انداز کے شعر نہیں کہے گئے ہیں البتہ اس وقت جب کہ پریم چند کو سمجھنے کے لالے پڑے ہوں سلیم صدیقی کے اس شعری رویے کی تحسین ہی کی جا سکتی ہے۔ سلیم صدیقی نے چھوٹی بحروں میں بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں۔ بعض اشعار تو پیکر، مکالمہ اور بالمشافہ گفتگو کے ذیل میں آتے ہیں۔ سہل ممتنع کی خوبی اپنی جگہ تو ہے ہی:

آپ کیوں ہم سے ناراض ہیں
صرف اتنا بتا دیجیے

ترک تعلق اور ہم سے
مشکل ہے آسان نہیں

اس کے علاوہ یہ اشعار بھی ایک خاص جہت کی نمائندگی کرتے ہیں:

زندگی مثلِ بیابانِ الم
کیا کہوں کس کی بدولت ہوگئی

ستارے توڑ لانا دل بچھانا
کہا جاتا تو ہے ہوتا نہیں ہے

ہزاروں غم مرے دل میں مکیں ہیں
ترا غم ہی تو اکلوتا نہیں ہے

دستکوں کا جواب خاموشی
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا

کچھ اب کہ پیاس میں شدت ہے ایسی
کہ اس کے سامنے دریا نہیں کچھ

بجلیاں جسم میں آنکھوں میں شرارت توبہ
ہائے کیا خوب قیامت کی ادا پائی

یہ اور اس طرح کے دیگر اشعار سلیم صدیقی کے شعری رویے اور تخلیقی جہت کی طرف بھرپور اشارہ کرتے ہیں۔ ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلیم صدیقی ابہام کے قائل نہیں۔ پوری وضاحت سے وہ اپنے جذبوں کو پیش کرتے ہیں۔ درج بالا اشعار میں بہت سی سچائیاں ایسی ہیں جن سے سب لوگ واقف ہیں مگر اس انداز سے پیش کرنے کی روش کم ہی اختیار کی گئی ہے۔

سلیم صدیقی کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ہے اور امید کی جانی چاہیے کہ ان کا تخلیقی سفر اسی سرگرمی کے ساتھ جاری رہے گا۔ مختصر بحروں میں سلیم صدیقی نے زیادہ متاثر کیا ہے، لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ طویل بحروں میں وہ کامیاب نہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ وہ جذبات و احساسات کے اظہار پر پوری طرح قادر ہیں۔ انہوں نے رواں اور عام بحروں کے علاوہ مشکل زمینوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ بعض مشکل قوافی بھی انہوں نے خاصی مہارت کے ساتھ باندھے ہیں۔ آخر میں چند آزاد نظمیں اور مختلف موضوعات پر قطعات بھی شامل ہیں۔ ان سے بھی سلیم صدیقی کی مشاقی اور شعری قدرت کا خاطر خواہ اندازہ ہوتا ہے۔

سلیم صدیقی کا کلام پڑھتے وقت ایک احساس یہ ضرور ابھرتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ یہ ان لوگوں میں نہیں جو موضوعات کے انتخاب میں خاصے مشکل پسند واقع ہوئے ہیں۔ سلیم کا تو رویہ بالکل جداگانہ اور الگ ہے۔ اور ان سب میں ان کی ہمت کہ معمولی موضوعات کو بھی نہایت اہتمام سے پیش کیا ہے۔

ایک بار پھر میں سلیم صدیقی کو پہلے مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آخر میں قارئین کی نذر ان کا یہ شعر:

اپنا تو کام ہی ٹھہرا ہے خبر سازی کا
اپنی شام اور سحر ہوتی ہے اخبار کے ساتھ

◆

سلیم صدیقی کی سرشتِ غزل

پروفیسر خالد محمود
(صدر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)

سلیم صدیقی ایک بے باک صحافی اور صاف گو شاعر ہیں۔ انھوں نے انسان کی ذہنی پیچیدگیوں، قلبی کیفیتوں اور سیاسی و سماجی بوالعجبیوں کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو نتائج فکر کی روشنی میں شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

ستارے توڑ لانا، دل بچھانا
کہا جاتا تو ہے ہوتا نہیں ہے

یہ بظاہر ایک آسان سا شعر ہے۔ اس میں عشاق کے ان غیر حقیقی دعووں کے کھوکھلے پن کی جانب توجہ دلائی گئی ہے جو وہ معشوق کو اپنی مبالغہ آمیز محبت کا یقین دلانے کے لیے کرتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ لفظ و معنی میں تفاوت اور انسانی رشتوں میں درآنے والے قول و عمل کے تضاد پر بھی طنز کیا گیا ہے۔ سلیم صدیقی کا یہی انداز ان کی پہچان ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا برملا اور بے محابا اظہار کر دیتے ہیں۔ لگی لپٹی رکھنا ان کا شیوہ

نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ماحول فسادات کا تیار نہ کردے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کردے

ہمارے شہر میں ہر شے کی ایک قیمت مقرر ہے
سیاست کیا، صحافت کیا، وزارت کیا، عدالت کیا

محرومیوں نے میری کیا ہے مجھے اسیر
دنیا سمجھ رہی ہے کہ مغرور ہوگیا

جب محبت کی قدر ہوتی تھی
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

اپنے چھپر سنبھال کر رکھنا
ان دنوں آندھیوں کا موسم ہے

سلیم صدیقی چونکہ اخبار سے وابستہ ہیں اس لیے اس کے کردار سے بھی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اخبار کیا کچھ کرسکتا ہے اگر ایک صحافی کے طور پر وہ صحافت کے نبض شناس ہیں تو ایک شاعر کی حیثیت سے انسانی سماج اور اس میں پیدا ہونے والی ہلچل کے نباض بھی ہیں۔ یعنی عوام کی اجتماعی نفسیات اور ذرائع ابلاغ کے دائرہ اثر اور اس کی قوتوں اور کمزوریوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اس لیے جب یہ شعران کے قلم سے نکلتا ہے کہ:

ماحول فسادات کے تیار نہ کردے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کردے

تو اس کی معنویت میں یقین کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے۔ اس شعر میں لفظ ''پھر'' نہایت معنی اور توجہ طلب ہے۔ یہی معاملہ دوسرے اشعار کا ہے مثلاً دوسرے ہی شعر میں جن بیش قیمت اشیا کو بکاؤ مال کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے وہ سیاست، صحافت، وزارت اور عدالت جیسی عظیم المرتبت چیزیں ہیں کسی بھی معاشرے اور کسی ملکی نظام میں ان اشیا کی خرید وفروخت قومی وقار کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی زوال کی انتہائی پستی کا شرمناک پہلو ہے مگر المیہ یہ ہے کہ اس شرمناک پہلو کے ثبوت فراہم ہو چکے ہیں اس لیے ایک حساس شاعر دکھے ہوئے دل کے ساتھ اس صورت حال پر تلخ وترش تبصرہ کرنے پر مجبور ہے۔

یہی وہ جرأت اظہار ہے جو سلیم صدیقی کو ہر قسم کی مصلحت سے باز رکھتے ہوئے حق گو، حق پسند اور بے باک شعرا کا سرخیل بناتی ہے۔

تیسرے شعر کا انداز قدرے مختلف ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب انسان کے پاس ہر شے کی فراوانی ہو جاتی ہے یا بڑی بڑی حیثیتیں اس کو مصروف کر دیتی ہیں تو اس کے معاملات زندگی یکسر بدل جاتے ہیں۔ حلقۂ احباب بھی وہ نہیں رہتا، عزیز واقارب سے فاصلے قائم ہو جاتے ہیں اس طرح کچھ تو وہ مصروف ہوتا ہے اور کچھ مغرور ہو جاتا ہے یا سمجھ لیا جاتا ہے بقول شاعر

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

بعینہ یہی صورت حال کبھی کبھی اس شخص کے ساتھ بھی پیش آتی ہے جو ہر شے سے محروم ہو گیا ہے اور محرومیاں چھپانے کے لیے کسی سے نہیں ملتا اس کی خودداری یا خودنگہداری اسے دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے سے بھی باز رکھتی ہے۔ وہ دوسروں کی نظر میں قابل رحم بننا نہیں

چاہتا یا اپنی محرومیوں کو کامیابیوں میں تبدیل کرنے کے لیے ہمہ وقت تقدیر سے برسرپیکار رہتا ہے اور روز و شب کی مشقت کا اسیر ہو کر اپنی دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ سلیم صدیقی نے اس صورت حال کو تیسرے شعر میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

چوتھے شعر میں صرف اتنی سی بات کہی ہے کہ اب محبت کی قدر نہیں ہوتی لیکن یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں جو کسی کو معلوم نہ ہو دوسروں کے تجربات بھی بالکل یہی ہو سکتے ہیں۔ یہاں شعر کی جان اس کے بیان میں پوشیدہ ہے جس میں شاعر ماضی اور حال کے تقابل کے ساتھ اس زمانے کو یاد کیا ہے جب محبت کی قدر ہوتی تھی۔ شاعر کے لہجے میں حسرت ناکی ہے جو اس خواہش میں پیوست ہے کہ کاش وہ زمانہ آج بھی ہوتا یعنی محبت کی وہی قدر ہوتی جو پہلے تھی گویا اب محبت کی قدر نہیں۔ سادہ بیانی میں جو تاثیر پنہاں ہوتی ہے وہ اس شعر میں موجود ہے۔

پانچویں شعر میں چھپر اور آندھیوں کا ذکر ہے۔ چھپر، غربت و افلاس اور آندھی قوت اور جبر و استبداد کی علامت ہے جس طرح غربت کے کئی چہرے ہیں اسی طرح قوت بھی ہزار شیوہ ہوتی ہے۔ قوت کی آندھیاں غربت کے چھپروں کی ازلی دشمن ہیں وہ جب چلتی ہیں تو سب سے پہلے چھپر ہی اڑتے ہیں۔ آگ ہمیشہ گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں لگتی یا لگوائی جاتی ہے۔ سلیم صدیقی نے اس شعر کے ذریعے کمزور طبقے کو خبردار کیا ہے اور ایک باخبر صحافی کی طرح یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ان دنوں آندھیوں کا اندیشہ زیادہ ہے اگرچہ اب یہ ''ان دنوں'' دائمی سا ہو گیا ہے۔ چھپر، آندھی اور موسم میں رعایت ہے۔ دوسرے اشعار کی طرح سلیم صدیقی کے اس شعر میں بھی طنز آمیز سادگی موجود ہے جو ان کے اشعار کا خاصہ ہے کچھ اور شعر بھی پیش ہیں۔

اک پل سکون ہم کو میسر نہ ہوسکا
شہرت کے سانپ جب سے بدن پر لپٹ گئے

اب سائبان کون بنے راہگیر کا
جو سایہ دار تھے وہ شجر سارے کٹ گئے

اترا رہے تھے لوگ سہاروں پہ کس قدر
سورج جو سر پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

وقت کا انتظار ہے ہم کو
لوگ کہتے ہیں وقت مرہم ہے

زہر بھی پینا پڑتا ہے
حق گوئی آسان نہیں

ساتھ چلے تو راز یہ ہم پر فاش ہوا
اونچے قد والے بھی کتنے بونے ہیں

اب گردش حالات بگاڑے گی مرا کیا
ہے کیا جو بگڑنے کو مرے پاس بچا ہے

صلح کے واسطے بضد کیوں ہو
تیر باقی نہیں۔ کمان میں کیا

بے تکلفی، بے خوفی اور بے باکی سلیم صدیقی کی قوت اظہار کے وسیلے ہیں۔ حقیقت پسندی اور صاف گوئی انہیں مرغوب ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا، خفیف طنز، سلیس و سادہ (سیدھی اور سپاٹ نہیں) زبان اور راست بیانی وہ اوصاف ہیں جو سلیم صدیقی کی شاعری کو سلیم صدیقی کی شاعری بناتے ہیں اور جو ان کے شعری مجموعہ ''قلندر بولتا ہے'' میں قلندری کی طرح بولتے نظر آئیں گے۔

◆

سلیم صدیقی: قلندر مزاج شاعر

پروفیسر ابن کنول

سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

دہلی کو ہر اعتبار سے مرکزیت حاصل ہے۔ اس شہر میں نہ صرف تمام عالم کے لوگوں نے آکر پناہ لی، بلکہ سب نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اس کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میر نے دلّی کے گلی کوچوں کو اوراق مصور کہا۔ غالب کو اجڑی ہوئی دہلی پر بھی ناز تھا۔ اس دہلی میں اردو زبان اور شاعری نے وہ مرتبہ حاصل کیا جو کبھی فارسی زبان و ادب کو حاصل تھا۔ دہلی کی کشش کا یہ حال تھا اور ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہیں کا ہو رہا۔ امیر خسرو دہلی آئے اور دہلوی کہلائے۔ میر اور غالب بھی مہاجر تھے لیکن خود کو دہلوی کہلانے پر فخر کرتے تھے۔ بار ہا دہلی کے لٹنے کے باوجود دہلی میں آکر بسنے والوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

سلیم صدیقی کے والدین نے بریلی کو چھوڑ کر جب دہلی کو اپنا وطن ثانی بنایا تب وہ محض چار سال کے تھے۔ سلیم صدیقی کی شاعرانہ طبیعت کو دہلی کے شاعرانہ ماحول نے جلا بخشی۔ دہلی کے شعرا پر داغ دہلوی کا اثر کافی غالب رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ

تھی۔ داغ نے غزل میں نمایاں مقام حاصل کیا، دہلی میں بسنے والے شعرا نے بھی داغ کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے غزل کو ہی زیادہ تر اظہار کا ذریعہ بنایا۔ سلیم صدیقی کی غزل قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی غزل میں شاعری کے روایتی الفاظ بھی نظر آتے ہیں اور غزل کو نئی لفظیات سے بھی انہوں نے مالا مال کیا ہے۔ سلیم صدیقی کا مزاج قلندرانہ ہے۔ ان کی شخصیت کی سادگی ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی ان کی غزل کی انفرادیت ہے۔ انہیں ہر موضوع کو شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر آتا ہے:

اترا رہے تھے لوگ سہاروں پہ کس قدر
سورج جو سر پہ آیا تو سایے بھی گھٹ گئے

باپ سے کہتے ہیں بچے جلد۔ واپس لوٹنا
یہ سمجھ، یہ عقل، یہ بچوں کی ہشیاری بھی دیکھ

ماحول فسادات کا تیار نہ کر دے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کر دے

کاش آ جائے پلٹ کر وہ سنہرا دور پھر
بھائی، بھائی کے لئے منہ کا نوالا چھوڑ دے

سلیم صدیقی ذاتی زندگی میں انتہائی لطیف، شگفتہ اور سادہ مزاج ہیں۔ ان کے کلام کی لطافت، شگفتگی اور سادگی ان کی شخصیت کی عکاس ہے۔ ان کی شخصیت میں صوفیا کی سی عاجزی و انکساری ہے۔ اخبار سے وابستگی نے انہیں پورے عالم سے باخبر رکھا ہے اور اس با

خبری نے ان کے اندر ایک درد پیدا کر دیا ہے، پورے عالم کی انسانیت کا درد۔ یہی درد ان کی غزل میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے:

سرمایہ داروں کی راتیں دن سے بھی اجیاری ہیں
نادار و مفلس کے گھر میں دن میں بھی ہے اندھیرا بابا

اپنے چھپر سنبھال کر رکھنا
ان دنوں آندھیوں کا موسم ہے

کس سے فریاد اب کرے کوئی
حاکمِ وقت ہو گیا بہرا

جعل سازی ، فریب ، مکاری
آج کے دور میں ہنر ٹھہرا

سلیم صدیقی کے مزاج کا قلندرانہ پن اور بے نیازانہ انداز ان کے اشعار میں جھلکتا ہے:

مال و زر، لعل و جواہر کی ہمیں چاہ نہیں
ہم ہیں بے گانۂ دولت، اسے لعنت جانیں

دولت، غرور، حرص و ہوس اور رنجشیں
ان آفتوں سے دور ہی رکھنا خدا مجھے

آؤ مل کر اس دکھیاری دنیا کے دکھ دور کریں
میں جھونکا بن جاؤں ہوا کا اور برستا بادل تم

مسئلے تو زندگی کے ساتھ ہیں
مسئلوں سے کس لئے ڈرنا بھلا

شاعر اور صحافی اپنی بے خوفی اور بے باکی کے لئے مشہور ہوتے ہیں۔ سلیم صدیقی شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ اس لئے ان کے اظہار میں بے خوفی بھی ہے اور بے باکی بھی۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار پر قدغن نہیں لگاتے۔ جو محسوس کرتے ہیں وہی بیان کرتے ہیں، یہی قلندروں کا شیوہ ہے اور یہی انفرادیت سلیم صدیقی کو اپنے ہم عمر اور ہم عصر شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔

◆

قلندر بولتا ہے

پروفیسر شہپر رسول

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

سلیم صدیقی مجھے بحیثیت انسان بھی پسند ہے اور شاعر کی حیثیت سے بھی۔ میں نے اس کو سچے اور کھرے لہجے میں بولتے ہوئے سنا ہے اور اپنے خاص انداز کے شعروں پر داد حاصل کرتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ سلیم صدیقی دراصل وہ قلندر نہیں ہے جو صحرائے خاموشی کی مجذوبانہ انداز میں خاک چھانتا رہتا ہو۔ وہ تو نئے زمانے کا نیا قلندر ہے۔ اپنے عہد کے ہر سوال کو شعور کی ترازو پر تولتا ہے اور لفظوں کے جھروکوں سے نہایت سادگی اور توازن کے ساتھ بولتا ہے۔ اس کے روزمرّہ کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر اس نے نرم یا گرم لہجے میں اظہار نہ کیا ہو۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس کے لہجے کی سادگی اور سوز و ساز میں جو گداز پنہاں ہے وہ اس مفروضے کو بنیاد بخشتا ہے کہ اگر فن کار ذاتی طور پر نیک اور اچھا ہو تو اس کے تخلیقی تجربات بھی سچائی اور اپنے پن کے حامل ہوتے ہیں۔ سلیم صدیقی کے اندر کا قلندر نئی زندگی کے تضاد، ریاکاری، سفاکی، درندگی، کم نگاہی، بولہوسی، چیرہ دستی اور ان تمام امور کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی بدامنی نیز انسانی اقدار کی بے توقیری پر

انتہائی بے دریغ لیکن دردمندانہ ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے اشعار فنی پیش کش کے ساتھ ہی جذبے کی صداقت پر بھی اصرار کرتے ہیں:

شمعِ تہذیب بجھ رہی ہے سلیم
روشنی دل جلا کے کی جائے

نہ جانے کب تلک یوں امتحانوں سے گزرنا ہے
ہماری مشکلوں کا دور ہوگا ختم کب جانے

یہ رہِ عشق ہے اس راہ پہ چلنا ہے تو پھر
زخم کو پھول کہیں درد کو راحت جانیں

راہِ حق میں میرے مولیٰ تو ہی راہ نمائی کر
منزل بھی معلوم نہیں اور رستے بھی انجانے ہیں

ساقی کے التفاتِ مسلسل کے باوجود
محسوس ہو رہی ہے ابھی تشنگی مجھے

اک سے ایک ملیں تو اکثر وہ گیارہ ہو جاتے ہیں
اتنی چھوٹی بات کو آخر سمجھے گا ہمسایہ کب

اب عشق میں نہ قیس نہ فرہاد ہے کوئی
تارے شمار کون کرے ہجر یار میں

یادوں کے پربتوں پہ جمی برف بہہ گئی
ماضی کے زخم کھل اٹھے پھر سے بہار میں

سامنے میرے دنیا اجڑ بھی گئی
اور میں تھا کہ بس دیکھتا رہ گیا

کب تک تنہا تنہا جیتے کب تک دل کو سمجھاتے
جسم سے اپنے باندھا تھا جو سانس کا بندھن کھول دیا

وہ سامنے تھا اور اس کو نگاہ چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی یا حوصلے کم تھے

سلیم صدیقی جب ذات کے دریچوں سے کائنات کا دیدار کرتا ہے تو اس کا ردعمل استعجاب وحسرت پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ شکوہ وملامت پر۔ اسی لیے اس کے یہاں غم وغصہ اور گھن گرج کے بجائے حیرت آمیز تاسف کی کیفیت ہے جو ایک خاص طرح کی اپنائیت سے دوچار کرتی ہے۔ ہر شخص بلکہ ہر سوچنے والا شخص چیزوں، رشتوں، رویوں اور نتائج کو اپنی آنکھ سے اور اپنے ہی انداز میں دیکھتا ہے لہذا اس کا اپنا احساس بھی ہوتا ہے اور نظریہ بھی۔ گویا وہ سنے سنائے اور بتائے گئے کے بجائے دیکھے اور خود پر گزرے ہوئے پر انحصار کرتا ہے۔ سلیم صدیقی نے بھی ایسا ہی کیا ہے لہذا اس کے مشاہدات، محسوسات اور تجربات اپنے بھی ہیں اور انجذاب واظہار کی سادگی کے غماز بھی۔

سلیم صدیقی شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت کے کارزار کے مرد میدان بھی ہیں چنانچہ ان کے بعض اشعار میں صحافتی مذاق کے ساتھ خطیبانہ اور سیاسی موضوعات کی نمائندگی بھی ہوتی

ہے۔ حالانکہ نئی شاعری میں اس طرح کے عناصر کو چنداں وقیع نہیں گردانا جاتا لیکن حسن کی ہر ادا اور فن کے ہر اسلوب کی کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ بقول غالب ''ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے'' شاعری میں خطابت اور بعض واقعات و اشارات کو تمثیلی پیرائے میں سادگی کے ساتھ ادا کرنے کی اہمیت پر بعض علمائے ادب نے خاصا زور دیا ہے۔ چند اشعار اس انداز کے بھی ملاحظہ کیجیے:

نئے شہروں کی سڑکیں بھی نئی ہیں
برائے نام سر پر سائباں ہے

ماحول فسادات کا تیار نہ کردے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کردے

اپنی خود غرضی کی خاطر مذہب کا ہتھیار لیے
بستی بستی گلیوں گلیوں بانٹ رہے ہیں نفرت لوگ

ملک و ملت کا وفادار ہوں لیکن سن لو
میں وفاداری نہیں رکھتا ہوں سرکار کے ساتھ

قوم کے غم میں وہی اشک بہاتے ہیں بہت
قوم کا سودا جو کرلیتے ہیں اغیار کے ساتھ

اپنا تو کام ہی ٹھہرا ہے خبر سازی کا
اپنی شام اور سحر ہوتی ہے اخبار کے ساتھ

سلیم صدیقی نے غزل گوئی کے ساتھ نظم اور قطعات نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا اصل وسیلۂ اظہار غزل ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی فنی پُرکار سادگی کے ساتھ لہجے کا دھیما پن، مٹھاس اور خلوص اس کی غزل کے ایسے بنیادی اجزا ہیں جو ادبی حلقوں میں اس کے اولین شعری مجموعے ''قلندر بولتا ہے'' کی مناسب پذیرائی کے ضامن ہوں گے۔

◆

سلیم صدیقی کا رزمیاتی آہنگ

حقانی القاسمی

وقت کے ہونٹوں پہ جو شعر رواں ہو جاتے ہیں، ان کی قیمت ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ہر شعر کو نہ سینہ نصیب ہوتا ہے اور نہ مصرعوں کو ہونٹوں کی پناہ ملتی ہے۔ محبوبیت اور مقبولیت کے ستارے ہر شعر کا مقدر نہیں ہوتے۔ خاص طور پر نئی نسل کے شاعروں کا نصیب تو اتنا روشن نہیں ہے کہ انھیں شہرت و مقبولیت کے ساتھ عظمت و اعتبار بھی حاصل ہو۔

اس کی کئی وجہوں میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کے شعرا اپنے اطراف و اکناف کی سیاحت کرتے کرتے ہی دم توڑ دیتے ہیں اور زندگی کا حصہ بننے سے پہلے ہی دام اجل میں آ جاتے ہیں۔ زوالِ ذوق کی وجہ سے عمدہ شعروں کا بھی حشر اچھا نہیں ہوتا۔ صرف وہی شعر حوالوں میں شامل ہوتے ہیں جنہیں لفظیات اور فکریات دونوں سطحوں پر استحکام حاصل ہو۔

آج صورت حال یہ ہے کہ لفظیات میں کشش ہے تو فکریات میں اضمحلال۔ شاعروں کا المیہ یہ ہے کہ اب انھیں زبان کے کنوئیں جھانکنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مشاہدے کی۔ جن

شعروں میں مشاہدے کی قوت ہوتی ہے اور زندگی کے ویژولس ہوتے ہیں وہ شعر ذہنوں میں جگہ بنا لیتے ہیں اور ان سے سماعتوں کا رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔

کس قدر دیکھئے معصوم ہے قاتل میرا
قتل کرتا ہے مگر ہاتھ میں شمشیر نہیں

کم سے کم اس میں تو کچھ امن و سکوں رہنے دو
یہ مرا دل ہے کوئی وادئ کشمیر نہیں

دیش بھگتی کی سند مانگنے والے سن لیں
ملک سب کا ہے کسی ایک کی جاگیر نہیں

یہ تاج خسروی تم کو مبارک
یہ شاہوں سے قلندر بولتا ہے

مسئلہ یہ نہیں کہ کم ہے اناج
مسئلہ سڑ رہے اناج کا ہے

کیسی تشویش ملک و ملت کی
سارا جھگڑا تو تخت و تاج کا ہے

یہ وہ شعر ہیں جن میں عنوان بننے کی پوری قوت موجود ہے۔ ان میں کچھ شعر سیاسی بیانیہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر داخلی تخلیقیت سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ان کی معنویت مختلف

ہوگئی ہے۔ ان شعروں میں جہاں عصری حسیت ہے وہیں سماجی دردمندی کا احساس بھی۔ ایک شاعر جب تک سماج کے جز و کل سے آگاہ نہ ہو اس طرح کے شعر اس کی تخلیقی فکر یا کلچر کا حصہ نہیں بن سکتے۔ یہ اشعار صحافتی اظہاریہ بھی کہلا سکتے ہیں۔ مگر ان میں شعری جمالیات کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہے اور وہ تخلیقی جوہر بھی جو نثری ساخت کو ترنم اور آہنگ عطا کر کے اس کی پوری کیفیت تبدیل کر دیتا ہے۔ ان اشعار میں ہمارے عہد کا آشوب ہے، زمانے کی تصویر ہے، حیات و کائنات کے حقائق ہیں۔ سماج کی داخلی تنظیم و ترتیب کے بکھراؤ کا بیان ہے۔ سیاست اور سماج سے مکالمہ کی شکلیں بھی شاعری میں نمایاں ہیں اور وہ طنزیاتی تاثر بھی ہے جو صحافتی زوم لینس کا کرشمہ یا کاریگری ہے۔

شاعری میں حیرتیں اور ندرتیں نہ ہوں تو شاعری اپنی تاثیر کھو دیتی ہے۔ سلیم کے یہاں زیادہ نہ سہی مگر تحیر کا وصف موجود ہے:

دینے کو ان کے پاس دعا تک نہیں بچی
اس سے زیادہ ہوگی کوئی مفلسی کی حد

سلیم صدیقی کی شاعری میں احساس و اظہار کی ہم مرکزیت ہے۔ ان کے بیشتر شعروں میں دونوں سطح پر توانائی وہ عنصر ہے جس نے ان کے کچھ شعروں کو انبوہ سے الگ کر دیا ہے۔

سلیم صدیقی کی شاعری میں مشاہدہ کے ساتھ مجاہدہ بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی شاعری میں حرکی توانائی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

ملک کی گلیاں لہو پینے کی عادی ہو نہ جائیں
یہ تعصب کا زہر ذہنوں میں بھرنا چھوڑ دے

مذہبی جذبات کے سارے پٹارے بند کر
اے سیاست کے مداری یہ تماشہ چھوڑ دے

منصف کا کیا قصور ہے قانون کیا کرے
سارے گواہ وقتِ گواہی پلٹ گئے

نفرت کی آندھیوں نے نگر کر دیا کھنڈر
ہے ہر طرف دھواں ہی دھواں آگ لگ گئی

نئے شہروں کی سڑکیں بھی نئی ہیں
برائے نام سر پر سائباں ہیں

کبھی غدار کبھی موردِ الزام جفا
یہ صلے ہم کو ملے ملک کی خدمات کے بعد

لٹ گیا صبر وسکوں چند ہی لمحات کے بعد
شہر میں کچھ نہ بچا اب کے فسادات کے بعد

یہ معاشرہ کی کلی خارجیت کا پر اثر داخلی اظہار ہے۔ سلیم صدیقی کی خاص بات یہ بھی ہے کہ کچھ غزلوں میں رمزیاتی کے بجائے رزمیاتی انداز اختیار کیا ہے۔ جبکہ غزل رمزیت اور ایمائیت سے عبارت ہوتی ہے۔ رمز سے قدرے انحراف ان کی شاعری کے لئے یوں بھی زیبا ہے کہ قلندر کنایوں میں بات نہیں کرتا۔ وہ دوٹوک لہجے میں اپنے باطنی احساس کا اظہار کرتا ہے۔ اس

کا سماج سے سیدھا تخاطب ہوتا ہے۔ وہ مقتل میں منصور اور سرِ دار بھی سقراط ہی رہتا ہے۔ سلیم کے شعروں میں وہی رجزیاتی آہنگ ہے جو منصور سے مخصوص ہے۔:

جس میں نا کردہ گناہوں کی سزا دی جائے
ایسی جمہور کی تاریخ مٹا دی جائے

کارواں جس کی حفاظت میں لٹے ہوں اکثر
ایسے رہبر کو سر عام سزا دی جائے

سیاسی سماجی مسائل کے ادراک وآگہی نے ان کے شعروں کے تیور تند کر دئے ہیں اور اس تندی نے ان کے شعروں میں تاثیر کی توانائی رکھ دی ہے۔ سیاسی سماجی جبریت کے خلاف شاعر کا انفرادی آہنگ، اجتماعی آہنگ میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یہی فنکار کی کامیابی ہوتی ہے کہ اس کی آواز ہر فرد کا احساس بن جائے۔ سلیم صدیقی اس محاذ پر کامران نظر آتے ہیں کہ ان کے تخلیقی وجدان پر اجتماعیت کے آمنا صدقنا کی مہر ثبت ہوگئی ہے۔

سلیم صدیقی کی شاعری حیات و کائنات کے شام وسحر کا روزنامچہ ہے۔ وہ شام وسحر جس کا رشتہ ماضی سے بھی ہے اور مستقبل سے بھی۔ یہ زمانی ومکانی تعینات سے ماورا شام وسحر ہیں جن میں حقیقتیں اپنی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ سلیم کی شاعری میں انہی بدلتی حقیقتوں کا عرفان ہے۔ عالمگیریت، استعماریت، فسطائیت سے لے کر جدید انسان کے بحران تک کے موضوعات اور مسائل اس شاعری کے متن کا حصہ بنے ہیں

اب امن و سکوں ہے نہ کوئی جشن نیا ہے
اس دور کی تقدیر میں بس کرب و بلا ہے

یہاں انسان کا ناحق لہو سڑکوں پہ بہتا ہے
یہ جنگل راج ہے اس راج میں جانوں کی قیمت کیا

پیسہ ہی آج زیست کی میزان ہے سلیم
علم و ہنر کی اب کوئی قیمت نہیں رہی

یہ ایک ہی سمت میں سفر کرنے والی شاعری نہیں ہے۔ اس کا دائرہ صارفی سماج سے مابعدالطبیعاتی احساس تک پھیلا ہو ہے۔

haqqqanialqasmi@gmail.com

Cell: 9873747593

* * *

محرمِ رازِ قلندری: سلیم صدیقی

فصیح اکمل

فلیٹ نمبر 8، کاسمو اپارٹمنٹ ، لین نمبر 12، ذاکر نگر ، نئی دھلی

اردو کے ایک اہم اور جدید لب و لہجہ کے شاعر قربانِ آتش کا مطلع فوری طور پر میرے ذہن میں اس وقت گونج کر رہ گیا جب دہلی کے ایک سلیم الطبع اور خوش فکر شاعر سلیم صدیقی نے اپنے مجموعہ کلام ''قلندر بولتا ہے'' کا ایک نمائندہ منتخب کلام مجھ جیسے کم علم کو اپنی رائے لکھنے کے لئے مرحمت فرما کر مجھ پر احسان کیا۔ قربان آتش کا مطلع دیکھئے:

نگاہِ فقر ہی شانِ سکندری جانے
وہی ہے شاہ جو رازِ قلندری جانے

جب میں نے سلیم صدیقی کا انتخاب کلام دیکھا تو اس مطلع کی روشنی جگہ جگہ ان کی افتاد طبع کے ساتھ مجھ پر روشن ہوتی گئی۔ شاعری کی تعریف میں امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' کے وہ جملے بھی ذہن میں روشن ہوتے چلے گئے، جس میں انہوں نے بہت واضح الفاظ میں شاعروں کے تعلق سے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

”شاعری رضائے الٰہی کی ایسی نقل ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین فطرت ہیں جنہوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا ہے۔۔۔۔ اس عالم درونی و بیرونی کی جو نقل صحیح الفاظ بامعنی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے وہ شاعری ہے‘ (کاشف الحقائق ص80)

آیئے تجزیہ کرتے ہیں کہ اس مرحلے سے ہمارے سلیم صدیقی کس خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے عہد کی مصوری کس قلندرانہ شان سے اپنے الفاظ میں کی ہے:

اب سائبان کون بنے راہگیر کا
جو سایہ دار تھے وہ شجر سارے کٹ گئے

لب و رخسار سے میں نے کبھی رغبت نہیں رکھی
زمانے کے تقاضوں پر ہی کی ہے شاعری میں نے

سنا ہے تخت شاہی ٹھوکروں میں اپنی رہتے تھے
کبھی ہوگی حقیقت آج تو لگتے ہیں افسانے

نئے شہروں کی سڑکیں بھی نئی ہیں
برائے نام سر پر سائباں ہے

ایک سقراط کی ضرورت ہے
نفرتوں کا جو زہر پی جائے

اس انتخاب سے میرا مقصد اس زاویہ ٔ نظر کی تشریح ہے جو ایک قلندرانہ نگاہ کا تقاضا کرتا ہے۔ شعر محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا وہ تو اس پس منظر کا ایک ہلکا سا جائزہ ہوتا ہے جو پس الفاظ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس مختصر سے انتخاب میں سلیم صدیقی کی کیفیت قلبی اور ذہنی پس منظر میں پوشیدہ پرچھائیوں کا صاف جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس عہد کی بے معنویت اور ٹوٹتی قدروں کا نوحہ ان اشعار سے صاف سنائی دیتا ہے:

میرے اصول مجھ کو کبھی کچھ نہ دے سکے
اس کے سوا کہ بکنے کو مجبور ہو گیا !

یہ دور صداقت کا طلبگار نہیں ہے
حق گوئی کہیں نذرِ سرِ دار نہ کر دے

سلیم صدیقی کو جو لوگ اچھی طرح جانتے ہیں، پہچانتے ہیں کہ نہیں یہ الگ مسئلہ ہے، کہ وہ ہمیشہ ایک اضطراب کی سی کیفیت میں رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی اضطراب ان کی شناخت اور قلندری کے زاویہ ٔ نظر کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ ان کا انتخاب مجموعہ کی شکل میں جب منظر عام پر آئے گا تو اپنے کئی ہم عصروں کو اچھی اور سچی شاعری کا مفہوم واضح کرنے کے لئے ثبوت اور سند کا کام کرے گا۔ میری نیک تمنائیں اور دلی دعائیں ان کے ساتھ ہیں، خدا ان کا قد اپنے ہم عصروں میں اسی شان قلندری کے ساتھ سربلند رکھے (آمین)۔

◆

زمانے کے تقاضوں کا شاعر

فاروق ارگلی

25، گنیش پارک دھلی .51

امتدادِ زمانہ نے میر و غالب کی دلّی کے خط و خال بدل ڈالے، تغیر پذیر نئی تہذیب نے دہلوی اقدار اور روایات کے نقش و نگار مٹا ڈالنے میں کور کسر باقی نہ رکھی۔۔۔ مگر مادّی ترقی اور نفسی نفسی کا یہ طوفان بلاخیز بھی اس شہر علم و ہنر کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی ان آوازوں کو نہیں مٹا سکا جو آج بھی اہل دل کی بہری ہوتی سماعتوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اردو زبان و تہذیب کی لافانی آوازیں ہیں جو شعر و سخن کے پیکر میں ڈھل کر دنیا پر یہ واضح کرتی رہی ہیں کہ صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کی زندہ علامت اردو زبان اور اس کی روح پرور شاعری کو ہرگز فنا نہیں کیا جا سکتا۔ اردو شعر و سخن کی ان آوازوں میں ایک منفرد آواز سلیم صدیقی کی بھی ہے، جس میں عہد رفتہ کی مہکار بھی ہے اور عہد نو کی جھنکار بھی، روایات کے رنگ بھی اور عصری شعور کا آہنگ بھی اور ایسی شخصی، فکری، علمی و فنی خصوصیات بھی جو اسے بحیثیت ایک انسان اور بحیثیت ایک شاعر اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز بناتی ہیں۔

سلیم صدیقی کا شمار ملک کے تیز طرار اردو صحافیوں میں ہوتا ہے مگر عصری زندگی کے تمام

گوشوں پر گہری نظر رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ سلیم صدیقی کی پہلی محبت ان کی شاعری ہے۔ بطور ایک بیدار مغز صحافی ملکی وغیر ملکی سیاسیات، حالاتِ حاضرہ کا گہرا شعور اور انسانی زندگی کے حقائق سے عملی آگہی۔ نے ان کی شاعری کو وقیع، بامعنی اور اثر آفریں بنا دیا ہے۔

ہمارے زمانے کے اس البیلے اور مست مولا شاعر سلیم صدیقی کو پاس سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ دوستی اور محبت کے علمبردار اور دہلوی تہذیب کے پاسدار، نیک اطوار، صاف گو اور حتی الامکان سچ بولنے والے انسان ہیں۔ بطور ایک کامیاب صحافی اور ملک کے بڑے مشاعروں میں داد و تحسین کے انبار سمیٹنے کے باوجود عاجزی و انکساری کے پیکر سلیم تصنع اور خودستائی سے کوسوں دور ہیں، لگی لپٹی نہیں جانتے، صاف صاف بات کرنا ان کی فطرت ہے، مطلب برآری کے لئے کسی کی بے جا تعریف کرنا سیکھا ہی نہیں، مزاج کا یہ کھرا پن اور شان قلندری سلیم کو ان حالات نے بخشی ہے جن میں وہ پلے بڑھے، جہاں محرومیوں اور مایوسیوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے اپنی ہمت، محنت اور ریاضت کا تنکا تنکا جوڑ کر اپنی دنیا خود تعمیر کی، صبر و استغنا کی دولت جمع کی، اپنے دل کی مملکت کے سلطان بنے، دنیا کے بادشاہوں سے برملا کہہ دیا:

یہ تاج خسروی تم کو مبارک
یہ شاہوں سے قلندر بولتا ہے

یہ شان قلندری محض ایک استعارہ نہیں، یہ سلیم کی زندگی کا جزو اور ان کی شخصیت کی شناخت ہے۔ اپنے اولین شعری مجموعے کا عنوان "قلندر بولتا ہے" رکھنا اس حقیقت کا اظہار ہے۔

سلیم صدیقی کا یہ مجموعہ کلام کی 30-25 سالہ شعری ریاضتوں کا ماحصل ہے۔ یہ اس

وقت شائع ہو رہا ہے جب وہ صاحب دیوان ہونے کے بغیر بھی اپنے وقت کے مقبول و مشہور شعرا کی صف میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ اتنی تاخیر سے اس کتاب کی اشاعت کی وجہ سلیم کی قلندرانہ لا پروائی کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاید یہ کتاب اب بھی منصۂ شہود پر نہ آتی، اگر دوستوں اور قدر دانوں نے انہیں مجبور نہ کیا ہوتا۔ بہر نوع یہ مجموعہ قارئین کے سامنے ہے۔ جس کے مطالعے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ نو کلاسیکی غزل کی روایات اور تلازمات کی پاسداری کے ساتھ یہ ایک الگ لب و لہجے کی شاعری ہے، خود شاعر کے مطابق:

لب و رخسار سے میں نے کبھی رغبت نہیں رکھی
زمانے کے تقاضوں پر ہی کی ہے شاعری میں نے

زمانے کے یہ تقاضے دراصل شاعر کی زندگی کے تئیں گہرا ادراک، وقت کی سفاک حقیقتوں کا مشاہدہ اور محسوسات ہیں۔ سلیم صدیقی کی شاعری پوری طرح اس پورے عہد اور ماحول کا منظر نامہ بن کر سامنے آتی ہے، جس میں آج کا ایک حساس انسان زندگی کرنے پر مجبور ہے۔ سلیم بات گھما پھرا کر نہیں کرتے اس لئے وضاحت اور تفسیر کی ضرورت نہیں:

جلا کر مضطرب ہے میرا گھر اب
مرا صیاد کتنا مہرباں ہے

ماحول فسادات کا تیار نہ کر دے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کر دے

مذہبی جذبات کے سارے پٹارے بند کر
اے سیاست کے مداری یہ تماشہ چھوڑ دے

ہمارے شہر میں ہر شے کی اک قیمت مقرر ہے
سیاست کیا، صحافت کیا، وزارت کیا، عدالت کیا

وقت نے دے دئے ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم
جو ادب اور صحافت کو تجارت جانیں

باری باری سب کا نمبر آئے گا
جو بھی سچ بولے گا مارا جائے گا

میرا دعویٰ ہے وہ خلعت پائے گا
خود داری جو گھر پر رکھ کر آئے گا

رنجشیں اور بھی بڑھتی گئیں بٹوارے سے
مسئلہ ختم کہاں ہو گیا دیوار کے ساتھ

اب یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، روز نیا حکم
می لارڈ ہمیں یہ بھی بتا دیں کہ کریں کیا

اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ تو کیجے آپ
سارے دن مزدوری کر کے جو لوٹ آئے خالی ہاتھ

آؤ مل کر اس دکھیاری دنیا کے دکھ دور کریں
میں جھونکا بن جاؤں ہوا کا اور برستا بادل تم

اس ترقی یافتہ دنیا میں اب تو اے سلیم
رہبری رسماً ، رواجاً رہزنی ہونے لگی

یہ انقلاب ہے یا زمانے کا ارتقا
قتل و فساد دیکھے جہاں تک نظر گئی

سلیم کی شاعری میں اپنے گرد و پیش کی یہ براہ راست تصویر کشی ایک صاحب نظر اخبار نویس کی آواز ہے، جو اس شدت اور بے باکی کے ساتھ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سلیم کی شاعری غزل کی رعنائیوں سے معرئ ہے، سلیم کے یہاں دہلوی غزل کی رنگینی، سلاست، شوخی اور متانت سب کچھ موجود ہے، سلیم کے یہ اشعار دیکھیں، داغ کا خیال آجائے گا:

پڑھ لی کتنے ہی دوانوں نے نماز الفت
جب بھی محراب نظر آئی تری انگڑائی

اف نہ کی ہم نے یہی سوچ کے خاموش رہے
ہو نہ جائے کہیں محفل میں تری رسوائی

ایک ہی پل میں بدل جاتے ہیں رشتے کیسے
آج محسوس ہوا ان سے ملاقات کے بعد

غالب اردو شاعروں کے لئے ہر دور میں تقلید و تتبع کا مرکز رہیں گے، غالب کی اس آسان زمین میں شعر کہنا بڑی بات نہیں، بات تو جب ہے کہ بڑی بات کہی جائے، سلیم کہتے ہیں:

چاہتی کیا ہے ، کچھ تو واضح ہو
زندگی تیرا مدعا کیا ہے

کیا بتائیں گے اگلی نسل کو ہم
پیار کیا چیز ہے وفا کیا ہے

سلیم نے غزلوں کے علاوہ پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ جن میں ''تغیر'' کے عنوان سے ان کی پابند رومانی و محسوساتی نظم، بابری مسجد سانحہ پر ''6 دسمبر کی عید'' آزاد نظموں میں 'تشدد'، 'بے ضمیری کا مرثیہ'، 'زرد آندھی' اور 'سرحد' ایسی تخلیقات ہیں جو براہ راست ذہنوں پر اثر کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سلیم صدیقی کے اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہر دل سے یہ دعا نکلے گی کہ اللہ کرے یہ قلندر اسی طرح بولتا رہے۔ آمین۔

⁂

سلیم صدیقی کا رنگِ تغزل

ڈاکٹر مشتاق صدف

پروگرام آفیسر ، ساہتیہ اکادمی دہلی

سلیم صدیقی روشن ضمیر صحافی کے ساتھ ایک روشن فکر شاعر بھی ہیں۔ گزشتہ بارہ برسوں سے میرے ان سے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' میں چھ برسوں کے بنواس کے دوران جن دوستوں کے ساتھ میں نے صحافت کے اسرار ورموز سیکھے ان میں سلیم صدیقی کا نام قابل ذکر ہے۔ سلیم صدیقی ایک کھلے ذہن کے انسان دوست شاعر ہیں اور دل دردمند بھی رکھتے ہیں۔ وہ خلوص ووفا کے پیکر بھی ہیں۔ ان کی گفتگو میں شائستگی اور لہجے میں نرمی دل کو خوب بھاتی ہے لیکن ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آبگینۂ جذبات کو ذرا سی ٹھیس پہنچی کہ وہ اپنے رد عمل کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور پھر کسی کو بھی بخشتے نہیں۔ ہمیشہ حق گوئی اور صداقت کی وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے مکروفریب اور سازش رچنے والوں کے وکیل بننے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ دراصل یہ خوبیاں ان کی شخصیت سے شاعری میں درآئی ہیں۔

سلیم صدیقی ایک عرصہ سے شعر گوئی کی طرف مائل رہے ہیں لیکن غم روزگار اور فکر معاش نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنے کلام کو یکجا کر کے اسے کتابی شکل میں پیش کرتے۔

جب انھیں معاشی فراغت نصیب ہوئی تو زندگی کے دوسرے مسائل اور نشیب و فراز میں الجھ گئے، لیکن اب یہ سوچ کر کہ زندگی کی الجھنوں سے کیسے کب نجات ملی ہے، وہ اپنا پہلا شعری مجموعہ 'قلندر بولتا ہے' منظر عام پر لا رہے ہیں۔ سلیم صدیقی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ ان کے اندر جو تخلیقی جوہر موجود ہے اس کی حوصلہ افزائی کی گئی تو شاعری کے کینوس کو وہ بھی کسی نہ کسی سطح پر وسعت بخشنے کی قوت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے نوحہ گروں کو سلیم صدیقی کا کلام ضرور پڑھنا چاہیے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ 'قلندر بولتا ہے' ان کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی عمل کتنا پائیدار اور نئے خیال اور نئی تازگی کی تلاش کس قدر اطمینان بخش ہے۔ یعنی سلیم صدیقی کے یہاں تخلیق کے عمل مسلسل اور نئی شعری فضا کی تلاش پیہم سے تخلیقی توانائی میں وفور کائنات کا جو عکس ابھرتا ہے اس میں نئی تازگی، نئے خیالات و احساسات اور تازہ افکار کی کونپلیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ در صل نئی تازگی کی تلاش اور تازہ افکار کی جستجو ہی سلیم صدیقی کی اصل شناخت ہے۔ کھوٹے سکوں کو بھلا کون سنبھال کر رکھتا ہے لیکن سلیم صدیقی کو دیکھیے کہ وہ کھوٹے سکوں کی قدر و قیمت سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان اشعار کا اقداری حسن ملاحظہ کیجیے:

وقت پڑا تو یہ بھی کام آجائیں گے
کر لیجیے محفوظ جو کھوٹے سکے ہیں

اس نے یہ سوچ کے ہی ہم کو سنبھالے رکھا
کھوٹے سکے بھی کبھی وقت پہ چل جاتے ہیں

منفی انسانی صورت حال سے بھی شاعر کا باطن پارہ پارہ نظر آتا ہے لیکن اس تکلیف

سے اس کے لیے تخلیقی قوت اور تحرک کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ اس قلندر صفت شاعر کے کلام میں بے بضاعتی کا احساس اور غم و غصے کا ایک الگ رنگ ملتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے تشویشناک حالات، سچائی، حق گوئی اور جذبۂ خلوص کی بدلتی فضا، جھوٹ اور سچ کے درمیان کشمکش کی جنگ پر نوحہ کناں ہے۔ اسے دستار کی عظمت تباہ ہونے کا غم بھی ہے اور حق بات بولنے پر اپنا سر سلامت نہ رہنے کا خطرہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ گویا شاعر حالات سے شکوہ سنج دکھائی دیتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تیری حق گوئی نہ بن جائے کہیں جاں کا عذاب   سوچ لے سر بھی نہ جائے کہیں دستار کے ساتھ
سچ بولنے پر بارہا ایسا بھی ہوا   دستار کی تو چھوڑیے سر بھی نہ بچا ہے
مولا خیر ہو ساحل کی   کیوں ہے آج سمندر چپ
ایثار، پیار، بوئے وفا، جذبۂ خلوص   اب آدمی کے پاس یہ دولت نہیں رہی
اشرف المخلوق کی پستی کا عالم یہ کہ اب   آدمیت ہے ہراساں آدمی کے نام سے
ہمیشہ خود سے شرمندہ رہا ہوں   کسی جھوٹے کو جب سچا لکھا ہے

سلیم صدیقی نے عصر حاضر کے آشوب سے تخلیقی تحرک حاصل کیا ہے۔ تبھی تو وہ موجودہ سماجی نظام کی بدحالی اور تخت و تاج کی رسہ کشی کے ساتھ امیر شہر کی ناحق شناسی پر وہ بار بار سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ مثلاً یہ چند اشعار:

حق گوئی کی بات پہ آج   صوفی، سنت، قلندر، چپ
کیسی تشویش ملک و ملت کی   سارا جھگڑا تو تخت و تاج کا ہے
دستار گر رہی ہے گرے، سر بچا رہے   کھولے امیر شہر کے آگے زبان کون

مجھ سے برہم ہے امیر شہر پھر   ایسا لگتا ہے کہ اب کے سر گیا
اگر وہ حق کا طرفدار ہے تو حق گوئی   امیر شہر کو کیوں ناگوار گزری ہے

تاہم شاعر ان ناگفتہ بہ حالات سے مایوس نہیں۔ وہ پوری دنیا کے زخموں کا مداوا ڈھونڈنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا سقراط پیدا ہو جائے جو نفرتوں کا سارا زہر ایک ہی سانس میں پی جائے۔ خدا کرے اس کے یہ اشعار دنیا کے دکھ درد کو دور کرنے اور نفرتوں کے مٹانے کے لیے کارگر ثابت ہوں:

ایک سقراط کی ضرورت ہے
نفرتوں کا جو زہر پی جائے
آؤ مل کر اس دکھیاری دنیا کے دکھ دور کریں
میں جھونکا بن جاؤں ہوا کا اور برستا بادل تم

سلیم کی شاعری میں کہیں وصل کا کیف آگیں تجربہ ہے تو کہیں فراق کی درد بھری کہانی۔ ایک اچھے شاعر کی یہ شناخت ہوتی ہے کہ وہ کبھی شعری اظہار میں اپنے متعین کردہ معیار سے نیچے نہیں اترتا نیز اسے اپنے اظہاری سانچوں پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ نیز ہر جگہ ایک متوازن شعری رویہ قائم رہتا ہے۔ سلیم کو بھی اظہاری سانچوں پر مہارت حاصل ہے اور ان کا ایک اپنا متوازن شعری رویہ بھی ہے۔ بلند آہنگی اور سطحی لہجہ سے ہر جگہ انھوں نے اپنا دامن بچایا ہے۔ ان کے یہاں لہجے کی نرمی سے جمالیاتی اور فکری گہرائی کا امتزاج بھی خوب ملتا ہے۔ ‘مضمون’ اور ‘کیفیت’ دونوں عناصر سے ان کی شاعری ہمارے دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار:

وہ بھی خاموش ہم بھی چپ چپ تھے   کہہ گئے پھر بھی دونوں دل کی بات
سچ تو یہ ہے وہ دید کا منظر عجیب تھا   وہ دیکھتا تھا آئینہ اور آئینہ مجھے
مدت کے بعد آئینہ دیکھا تو ڈر گیا   میں خود سے پوچھنے لگا یہ کیا ہوا مجھے
لمحہ لمحہ کون مرے کردار پہ پہرا دیتا ہے   میرے اندر چھپ کر مجھ کو دیتا ہے آوازیں کون

یہی نہیں غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ سلیم کے اشعار میں ایسے تصویری پیکر بھی ابھرتے ہیں جن کو نمایاں کرنے کے لیے ارتکاز کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان کے یہاں سہل ممتنع کا استعمال بھی قرینے سے کیا گیا ہے۔ چھوٹی موٹی اور بھولی بھالی بحروں میں ان کی غزلیہ شاعری خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ بڑی بحروں کے مقابلے چھوٹی بحروں میں کوئی خیال موزوں کرنا مشکل کام ہوتا ہے لیکن سلیم نے اس مشکل کو بھی بڑی ہنر مندی سے آسان کر دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مسلسل جو نوازش ہو رہی ہے   یقیناً کوئی سازش ہو رہی ہے
میرے کردار کا محافظ ہے   مجھ پہ میرے ضمیر کا پہرا
قسطوں میں جینا مرنا   ہم سب کی لاچاری ہے
دوستی کی آڑ میں ہے دشمنی   دوستوں سے دور ہی رہنا بھلا
مسئلے تو زندگی کے ساتھ ہیں   مسئلوں سے کس لیے ڈرنا بھلا
زہر بھی پینا پڑتا ہے   حق گوئی آسان نہیں

سلیم کی شاعری میں تاثیر اور احساس کی ایک تیز روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی قرأت سے تقرب، تقلب اور تطہیر غم کے عناصر بڑے اعتماد کے ساتھ سخن کی پل صراط

سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری بے ثباتی عالم کے مختلف رنگوں کی وجہ سے کثیر الجہات اور فکری محاسن کے اعلیٰ درجات پر فائز ہوتی ہے۔ انسانی نامرادی کی کوکھ سے جو احساس دل میں ابھرتا ہے وہی احساس مدام کیفیت حاصل کرنے کے لیے انجذاب کے مرحلہ سے گزرتا ہے۔ سلیم کے بہت سے اشعار میں یہ کیفیت ملتی ہے۔ ان کے ایک ایک شعر سے ان کی تخلیقی ترجیحات، تخلیقی سچائی اور تخلیقی بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے تخلیقی وفور اور تخلیقی جذبات کے باہمی انسلاک و انجذاب سے ایک الگ قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ چند اشعار اس حوالہ سے بھی خاطر نشان ہوں:

پگھلا گئی وہ موم کی مانند جسم کو　　جذبوں کی تیز دھوپ جو پل میں اتر گئی
ستارے توڑ لانا دل بچھانا　　کہا جاتا تو ہے، ہوتا نہیں ہے
گمنام تھے تو زیست بہت پر سکون تھی　　دکھ دے رہی ہیں ہم کو شناسائیاں بہت
کوہِ انا کی برف پگھلتی تو کس طرح　　جذبوں میں پہلے جیسی حرارت نہیں رہی
شہر کی دھوپ میں جب بھی مرا جلتا ہے بدن　　یاد آتے ہیں ترے گاؤں کے پیپل کتنے
پیٹ تو بھرتا نہیں ضد ہے کھلونوں کی انھیں　　اُف یہ بچے ہیں مرے شہر کے پاگل کتنے
کیا خبر کب اس کی یادیں لوٹ آئیں　　اس لیے رکھتا ہوں دل کا در کھلا

سلیم صدیقی کی شاعری اپنے اسلوب بیان، طرز ادا اور اپنے منفرد رنگ و آہنگ سے بھی مختلف ہے۔ اپنی فکریات اور موضوعات کے لحاظ سے بھی الگ ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی غیر مناسب نہیں کہ اردو شعرا کے حوالے سے ادھر جو مضامین لکھے جا رہے ہیں ان میں بہت سے جملے کلیشے کی شکل اختیار کر چکے ہیں مثلاً فلاں شاعر بہت بڑا اور عظیم ہے، فلاں ممتاز اور معروف شاعر ہے، فلاں

شاعر کا کوئی ثانی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ سلیم صدیقی کے حوالے سے مذکورہ کلیشے کا ذکر تو نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کی شاعری افکار تازہ اور سرد و گرم ہوا کے جھونکے سے عبارت ہے۔ میں ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کے مقام و مرتبہ پر بھی گفتگو نہیں کروں گا کہ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تعین قدر میں وقت لگتا ہے۔ تاہم ان کی شاعرانہ تلاش و جستجو اور افکار تازہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نئے شعرا میں وہ ایک قابل ذکر شاعر کے طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان کی شاعری وقت اور آزمائش کے مراحل سے گزر رہی ہے لیکن یہاں اتنی بات تو ضرور کہی جا سکتی ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی انفرادیت اس کے لب و لہجہ، اس کی تخلیق کے رنگ یا مزاج یا موضوعات کی سطح پر تعین کی جاتی ہے اور اس پہلو سے سلیم صدیقی کے شاعرانہ رنگ و مزاج اور لب و لہجہ کی ایک الگ پہچان ہے جو ہمیں داد دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس لہجہ کو آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

ساتھ چلے تو راز یہ ہم پر فاش ہوا
اونچے قد والے بھی کتنے بونے ہیں

اگر چاہیں تو اس لہجہ میں ہم بھی بول سکتے ہیں
مگر عادت نہیں ہم کو کسی کا دل دکھانے کی

جو اعتماد کے باعث ہو گمرہی کا سبب
کوئی ہمارے لیے اتنا معتبر بھی نہ ہو

میں اس کو بھولنے کی کوششیں بھی کرتا رہوں
دعا کو ہاتھ بھی اُٹھیں، مگر اثر بھی نہ ہو

مختصر یہ کہ سلیم صدیقی کی شاعری اپنے مزاج، رنگ اور لہجہ کے اعتبار سے منفرد نظر آتی ہے اور موضوعات کے تنوع سے ان کی شاعرانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ شعری منظرنامے میں ان کا کلام اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ وہ عصری مسائل، انسانی چیخ و پکار، درد و کرب اور اضطراب و انبساط کو فن سے مہمیز کر کے اسے ایک نیا لباس عطا کرتے ہیں۔ نیز لہجے کی نرمی اور خیال کی تازگی کے ساتھ اظہار بیان میں صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے رنگِ تغزل سے ہمارے دل میں ایک ایسا ارتعاش پیدا ہوتا ہے جو ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا حاصل ہے۔

میں سلیم صدیقی کے اولین شعری مجموعہ 'قلندر بولتا ہے' کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یہ یقین بھی کر رہا ہوں کہ اردو حلقوں میں اس تخلیقی کاوش کی قدر افزائی ہوگی۔

◆

سچائیوں کا معترف ایک قلندر

ڈاکٹر منور حسن کمال

غزل کہنا بہ ظاہر آسان نظر آتا ہے، لیکن اچھے اور عوام پسند اشعار کہنا نہ صرف ایک مشکل فن ہے، بلکہ غزل کے ان اوصاف سے آراستہ غزل کہنے والے معدودے چند ہی نظر آتے ہیں۔ ایک اچھی غزل شاعر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اس طرح آشکارا کرتی ہے کہ شاعر کی فنکارانہ عظمتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ اچھا اور سچا شاعر جو بھی لکھتا ہے، اپنے مشاہدات کے حوالے سے لکھتا ہے۔ اس کی شاعری بڑی ٹھوس، حقیقت افروز اور فکر انگیز نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی الفاظ کی بندش، پختہ خیالی اور خوشگوار تراکیب کا بہتر استعمال اس کی شاعری کو بلند معیار عطا کرتا ہے۔

اس حوالے سے جب ہم سلیم صدیقی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے فن پاروں میں عوام پسند شاعری کے نمونے بڑی تعداد میں سامنے آتے ہیں۔ سلیم صدیقی دہلی کے استاد شاعر وقار مانوی سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کسی کی پیروی کی ہے اور نہ کسی کے انداز پر چلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی عوام پسند شاعری سے عام لوگوں کے دلوں میں جو جگہ بنائی ہے، وہ ان کی اپنی ہی پیدا کردہ ہے۔

میرا ان سے تعلق کم و بیش دو دہائی کا ہے۔ اس سے قبل میں انہیں شاعر کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا، بلکہ صرف ایک صحافی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ اکثر ادبی و ثقافتی پروگرام میں نظر آتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد کبھی حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی تو کبھی پروگرام میں شامل ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے۔ میں نے انہیں کبھی کسی شاعر یا ادیب کی ہتک کرتے نہیں پایا۔ وہ جہاں اپنے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں، وہیں اپنے خردوں سے بھی ان کی نیاز مندی کے سبب بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ صحافی ہیں، اس لئے ان کی شاعری میں اس طرح کے نمونے پائے جاتے ہیں، جو پہلی نظر میں صحافتی خبر یا کوئی پیامی خبر نظر آتی ہے، لیکن ان کے سادہ الفاظ اس شعر کو عوامی سطح پر مقبول بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کی صحافتی زندگی کی چھاپ ان کی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ نظر آتی ہے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ وہ کہتے ہیں:

گلیوں گلیوں، شہروں شہروں کس نے آگ لگائی ہے
بغض و نفرت کا دنیا کو کس نے یہ ماحول دیا

تم نے سوچا تھا ہمیں جگ سے مٹا دو گے مگر
حوصلے اور بڑھے ہیں نئی آفات کے ساتھ

ایلیٹ نے لکھا ہے: ”شاعری اسی وقت ہمیں مسرت سے ہم کنار کرتی ہے، جب اس میں کسی تجربے کی ترسیل ہو۔ یہ ذہانت پیدا کرنے کا موجب ہو، اس میں کسی ایسی چیز کا اظہار ہوتا ہو، جس کا تجربہ تو ہمیں کبھی کا ہو چکا ہوتا ہے، لیکن جس کا بیان ہم تک نہیں پہنچ پاتا“۔ ایلیٹ کے اس خیال کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سلیم صدیقی نے شاعری کے بنیادی مقاصد میں مسرت آفرینی،

ذہانت کی تخلیق، نئے انداز سے تجربے کی ترسیل اور شائستہ احساسات کو سرفہرست رکھا ہے۔ ترسیل وابلاغ کے درج ذیل اشعار سلیم صدیقی کی شاعری کی روشن مثالیں ہیں:

اپنی خود غرضی کی خاطر مذہب کا ہتھیار لئے
بستی بستی، گلیوں گلیوں بانٹ رہے ہیں نفرت لوگ

مذہبی جذبات کے سارے پٹارے بند کر
اے سیاست کے مداری یہ تماشا چھوڑ دے

شاعری میں اسلوب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ شاعری کا اصل جوہر خیال، ٹھوس حقائق، معلومات اور بیان کی آمیزش سے بنتا ہے۔ سلیم صدیقی کے یہاں خیال آفرینی کے نمونے بھی نمایاں طور پر جلوہ گر نظر آتے ہیں:

اے چمن موسم گل کو آنے تو دے
ان کی یادوں کے غنچے چٹک جائیں گے

دل میں غنچے چٹک جائیں گے
آپ بس مسکرا دیجئے

سلیم صدیقی کا گزر جب وادئ عشق سے ہوتا ہے تو بھی ان کے ہاتھ سے شائستگی کا دامن نہیں چھوٹتا۔ محبوب کے لب ورخسار تو کیا آنکھ اور زلف بھی ان کی شاعری میں نکہت ونور کی طرح نظر آتے ہیں۔ محبوبیت کا جادو ان کے سر چڑھ کر نہیں بولتا، وہ وادئ عشق میں تو ہوتے ہیں، لیکن بے خطر نہیں ہوتے اور نہ ان کا محبوب ہی بے خطر عشق کی آگ میں کودنا چاہتا ہے۔ وہ مثبت سوچ وفکر

رکھنے والے ایک سچے اور متوالے ایسے شاعر ہیں، جو جرأت مندی اور بے باکی سے اپنے اشعار میں ایک فکری ترسیل کرتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ذہن رسا کی پہنچ اور گرفت کہاں تک ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اس کو شاعری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ وہ ایک فعال اور سرگرم صحافی کی حیثیت سے جتنے مستعد نظر آتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ان کی فکر کی جولانیاں شاعری میں نظر آتی ہیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے باخبر ہونا صحافی کی فطرت میں داخل ہے۔ سلیم صدیقی نے اپنی اس فطری صلاحیت سے شاعری میں بھی خوب کام لیا ہے۔ صحافت نے عصر حاضر کے تمام شعبوں کی طرح اردو زبان اور شعر و ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس دور کے شاعروں کے یہاں صحافت کا عکس خاص طور پر جھلکتا ہے۔ علی الخصوص ان شاعروں کے یہاں جن کا تعلق صحافت سے ہو۔ سلیم صدیقی کا تعلق چونکہ صحافت سے ہے، اس لئے وہ صحافت کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی بعض ایسے اشعار رقم کر جاتے ہیں، جن میں ماضی کی تہہ داریوں کے ساتھ ساتھ حال کی بھی تصویر نمایاں ہے:

لب و رخسار سے میں نے کبھی رغبت نہیں رکھی
زمانے کے تقاضوں پر ہی کی ہے شاعری میں نے

ظلم و ستم کا جن کے زمانہ ہے معترف
حاکم تمام ان کے طرف دار ہوگئے

اللہ رے سلیم بہ فیض سیاسیات
قاتل تمام صاحب کردار ہوگئے

سلیم صدیقی نے نوعمری سے ہی ادیبوں اور شاعروں کی مجلسوں سے فیض حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے گہرے مطالعے کا عکس صاف نظر آتا ہے:

سیاہ دل ہے سیاہی کا پاس رکھے ہے
بدن پہ اپنے چمکتا لباس رکھے ہے

جو گھر سے اپنے نکلتا ہے سخت پہرے میں
ہر ایک اس سے تحفظ کی آس رکھے ہے

سلیم صدیقی کی شاعری میں جو کرب نظر آتا ہے، وہ ایک عام انسان کا کرب ہے، ان کی شاعری میں سمندر کی گہرائی اور سورج کی تابناک سچائیوں کا نوحہ بھی نظر آتا ہے اور چمنستان کی بہارِ نو کا سکینہ بھی:

یہ سرد سرد رات یہ ماضی ورق ورق
ہیں جان لیوا یاد کے لمحات کس قدر

کوہِ انا کی برف پگھلتی تو کس طرح
جذبوں میں پہلے جیسی حرارت نہیں رہی

سلیم صدیقی جب محبت کی وادیوں میں قدم رکھتے ہیں تو بے ساختہ ان کے اشعار گنگنانے کو جی چاہتا ہے:

جاناں تیری فرقت کا، لمحہ لمحہ بھاری ہے
شہرِ دل میں جانے کیوں، ہُو کا عالم طاری ہے

سلیم صدیقی نے ’قلندر بولتا ہے‘ میں نظموں اور قطعات کو بھی شامل کیا ہے، جن سے ان کی شاعری کی دیگر اصناف سخن پر گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ نظم ’تغیر‘ میں انہوں نے بیس برس قبل ایک حسینہ سے اپنی ملاقات کا ایسا دل کش منظر پیش کیا ہے جو ہر نوجوان کو اپنے دل کی آواز نظر آتا ہے۔ بیس برس تک اس حسینہ کو اپنے دل میں قید رکھنے والے سلیم صدیقی اس جفا کی دیوی کو بھلا نہیں پائے اور دفعتاً سامنا ہو جانے پر وہ حسینہ جب پہچان نہیں پائی اور شاعر نے اپنا تعارف کرایا تو وہ گویا ہوئی:

وہ کلی تو مدت سے
پھول بن چکی ہے اور
اس نے اپنے ماضی کو
بھول کر زمانے کی
حالیہ روایت پر
سیکھا ہے عمل کرنا

یہ نظم ماضی کا آئینہ بھی ہے اور یادوں کا نگار خانہ بھی اور دل گرفتہ نوجوانوں کے لئے ایک سبق آموز کہانی بھی۔

سلیم صدیقی کی شاعری بلاشبہ وقت کے ہر اس نوجوان کی آواز ہے، جو اپنے ماضی سے رشتے استوار رکھنے کے ساتھ ساتھ حال پر بھی نظر رکھتا ہے اور مستقبل پر بھی۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام ’قلندر بولتا ہے‘ اردو حلقے میں نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا بلکہ دل گرفتہ شاعری کے متوالوں کے لئے روح کی گہرائیوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگا۔

mh2kamal@gmail.com

Cell:9873819521

✿

لاتحریک نئی نسل کا اہم فنکار

شمس رمزی

جنرل سکریٹری 'اردو تہذیب' دھلی

1980 میں جب میں نے اپنے وطن گنور ضلع بدایوں سے ہجرت کی اور دہلی کو وطن ثانی کے طور پر اختیار کیا، تو دو ماہ اوکھلا انڈسٹریل ایریا کے علاوہ باقی اب تک کی زندگی مشرقی دہلی میں گزری ہے۔ جب میں نے مشرقی دہلی کو مستقر بنایا تو میری پہلی ملاقات حاصل سنبھلی سے ہوئی اور کچھ دیر گفتگو کے بعد طے پایا کہ آپ بعد نماز عشا میرے ساتھ چلیں گے۔ لہٰذا بعد نماز عشا حاصل سنبھلی مجھے ساتھ لے کر 'لیاقت ٹی اسٹال' جعفر آباد پہنچے، جہاں شعرا کی ایک بڑی تعداد رات گئے تک مشغول ادب رہتی تھی۔ ان میں انجم رحمانی مرحوم، ندیم دہلوی مرحوم، انقلاب سرسوی، میکش امروہوی، آفتاب آزر، معین الدین محور نوری، آصف نظر، درشن لال زلفی، راز میرٹھی، سیف سحری، اسلم دہلوی، انور علیگ، شمیم اعظمی، سلیم صدیقی اور کچھ باذوق حضرات بلاناغہ شب گزاری کرتے تھے۔ کبھی کبھی کلیم شاہ آبادی مرحوم، نظمی سکندرآبادی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، شہباز ندیم ضیائی اور زیب حسنی وغیرہ کچھ وقت کے لئے آ جاتے تھے۔ ان میں سلیم صدیقی ہی نوجوان شاعر اور میرے ہم عمر تھے۔ یہاں آنے والے شعرا کا روز

کا معمول تھا کہ کسی نہ کسی مصرع پر طبع آزمائی کرتے اور ہوٹل سے اٹھتے وقت کاغذ کو پھاڑ دیا کرتے تھے۔ اس طرح میرا داخلہ اس حلقہ ارباب ادب میں ہو گیا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ سلیم 75-76 سے شعر کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ میرے سینئر ہیں۔

بنیادی طور سے سلیم صدیقی شاعر ہیں، لیکن آج ان کا شمار ملک کے ممتاز، معتبر اور معروف صحافیوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کے معروف روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ ہیں۔ اس سے قبل وہ روزنامہ فیصل جدید، روزنامہ ان دنوں، ماہنامہ 'آپکی کائنات' اور دیگر کئی اخبارات وجرائد میں اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں۔

اب ایک مدت کی مشق سخن کے بعد ''قلندر بولتا ہے'' کی صورت میں وہ بازار شعر و ادب میں اپنے مجموعے کے ساتھ بحیثیت شاعر متعارف ہو رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیم صدیقی ایک معروف صحافی اور نئی نسل لاتحریک کے ان فنکاروں میں سے ہیں جنہوں نے صحافت اور شاعری کے ذریعے ادب کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے۔ سلیم صدیقی نے شاعری میں کوئی نیا تجربہ تو نہیں کیا البتہ بزرگوں سے استفادہ کرتے ہوئے ہماری مضبوط شعری روایت کی توسیع ضرور کی ہے۔ آج کا انسان جن مسائل سے دوچار ہے، جس میں خوف وہراس، بے یقینی، رشتوں کی شکست وریخت، ہر قدم پر ایک کربلائی منظر، شہر در شہر فسادات، بم دھماکے، انسانی جانوں کا اتلاف یہ موضوعات ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتے ہیں۔ سلیم صحافی ہیں اور ان تمام مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس لئے آپ محسوس کریں گے کہ ان کی غزل میں تلخی کا رجحان کچھ زیادہ ہے، کیونکہ کوئی بھی انسان معاشرہ میں ہونے والے عمل اور ردعمل سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا، لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ سلیم نے جہاں ان موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے

وہیں انہوں نے آج کے اس کرب زدہ اور گھٹن کے ماحول میں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ انسان کو ان حالات سے گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے باہر آنا چاہئے اور کھلی فضا میں سانس لے کر دوسروں کو کھلی فضا میں سانس لینے کی دعوت دینا چاہئے۔ اسی لئے انہوں نے ان تمام مسائل کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ مثلاً

قسطوں میں مرنا جینا
ہم سب کی لاچاری ہے

قلم چلنے لگیں جب مصلحت کی روشنائی سے
تو پھر جھوٹی ہوں تحریریں تو اس میں یار حیرت کیا

ہمارے شہر میں ہر شے کی اک قیمت مقرر ہے
سیاست کیا، صحافت کیا، وزارت کیا، عدالت کیا

ایثار، پیار، بوئے وفا، جذبۂ خلوص
اب آدمی کے پاس یہ دولت نہیں رہی

کیسے کھلی فضا میں کوئی سانس لے سکے
کم ہو گئیں مکانوں کی انگنائیاں بہت

گمنام تھے تو زیست بہت پر سکون تھی
دکھ دے رہی ہیں ہم کو شناسائیاں بہت

وقت کا انتظار ہے ہم کو
لوگ کہتے ہیں وقت مرہم ہے

ان تمام اشعار میں وہی تلخ لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے ہم موجودہ دور میں نبردآزما ہیں، لیکن دوسری جانب سلیم نے یہ پیغام بھی دیا ہے کہ انسان کو ان حالات سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینی چاہئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سلیم صدیقی انسان کو اندھیروں سے اجالوں کی طرف لانے کی کوشش میں مصروف عمل ہیں۔ مثلاً:

آؤ مل کر اس دکھیاری دنیا کے دکھ دور کریں
میں جھونکا بن جاؤں ہوا کا اور برستا بادل تم

اک دن ایسا بھی آئے گا سچائی کی ہوگی جیت
سب کہتے ہیں ایسا ہوگا لیکن ایسا ہوگا کب

خواب کو سچ میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں
اب وہ بچے نہیں جو خواب سے ڈر جائیں گے

تم کو جینا ہے جو سچی زندگی
ظاہر و باطن کو یکساں کیجئے

ان اشعار میں پہلے شعر میں اسلوب، بندش اور آج کے دور کی بشری صورت حال کی عکس ریزی کے ساتھ حسن و عشق کا دلکش منظر بھی نظر آ رہا ہے۔ یہاں شاعر اپنے محبوب کی طرف مخاطب ہو کر دنیا کے دکھ درد دور کرنے کی بات کر رہا ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر کو یقین ہے کہ

ایک دن سچائی کی جیت ہوگی لیکن شاعر متحیر ہے کہ ایسا کب ہوگا، مگر یقین ہے کہ ضرور ہوگا۔ تیسرے شعر میں شاعر نے نئی نسل کی جانب اشارہ کیا ہے کہ نئی نسل صرف خواب نہیں دیکھتی بلکہ جو وہ سوچتی ہے اسے پورا کرتی ہے اور یہ سچائی ہے کہ آج ہم نے وہ معرکے سر کر لئے ہیں جو ہمارے بزرگوں کے خیال میں بھی نہ تھے۔ چوتھے شعر میں شاعر بڑی سادگی سے کہہ دیتا ہے اگر انسان بہتر زندگی جینا چاہتا ہے تو اسے اپنے ظاہر و باطن کو ایک ہی میزان میں تولنا ہوگا۔

سلیم صدیقی کا تعلق 1980 کے بعد کی لاتحریک نئی نسل سے ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تمام تحریکیں دیکھی ہیں، لیکن ان کی شاعری پر کسی تحریک کا اثر نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں روایت اور ارادت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کا یہی انداز فکر کہیں کہیں قاری کو چونکنے پر مجبور کر دیتا ہے، بلکہ مذاق سلیم پر ایک ضرب کاری لگاتا ہے۔

سلیم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مفہوم و معنی کے ایسے پھول کھلاتے ہیں، جس کی خوشبو سے آبروئے ادب یعنی غزل کا دامن مہکنے لگتا ہے۔ ان کے اشعار میں تہہ در تہہ کیفیات سے رونما ہونے والے احساسات کی روشنی سنجیدہ طرز فکر اختیار کر لیتی ہے اور ایک سادہ شعر بھی اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے جہان رنگ و بو کی سیر کراتا ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر سلیم صحافت کی طرف نہیں جاتے تو موجودہ عہد کے اہم فنکاروں میں اپنے لب و لہجے کے منفرد شاعر ہوتے۔ چند شعر بطور مثال احاطۂ تحریر میں لاتا ہوں:

کاش آ جائے پلٹ کر وہ سنہرا دور پھر
بھائی، بھائی کے لئے منہ کا نوالا چھوڑ دے

اس شعر میں جو امیجری ہے اور رشتوں کی شکستگی کا جو احساس اور درد ہے، اس کا اندازہ

وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو محبت اور وفا کے مفہوم سے اچھی طرح واقف ہیں، لیکن شعر میں 'کاش' کا استعمال غلط ہوا ہے۔ کاش ماضی تمنائی ہے۔ مرزا غالب اور تاجدار اہل سنت عظیم البرکت مجدّد اعظم اعلیٰ حضرت امام محمد احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمہ سے بھی اس میں سہو ہوا ہے:

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے۔ غالب

کاش محشر میں ہو آمد مصطفےٰ۔ اعلیٰ حضرت

بہر حال انسان کے کلام میں کہیں نہ کہیں سہو کا ہونا لازمی ہے۔ آیئے سلیم صدیقی کے چند شعر اور ملاحظہ کریں:

شکست عشق میں ہوتی تو در گزر کرتا
میں بد نصیب مگر دوستی میں ہار گیا

پیاسے کو قطرے کی بھیک
یہ تو کوئی احسان نہیں

زہر بھی پینا پڑتا ہے
حق گوئی آسان نہیں

جعل سازی، فریب، مکاری
آج کے دور میں ہنر ٹھہرا

وقت پڑا تو یہ بھی کام آ جائیں گے
کر لیجے محفوظ جو کھوٹے سکے ہیں

ہمیشہ خود سے شرمندہ رہا ہوں
کسی جھوٹے کو جب سچا لکھا ہے

بیٹیاں پھر عذاب لگنے لگیں
جہل پھر چھا گیا جہان میں کیا

آج کے دور میں معیار سے گرنا ہے ہنر
آج کے دور میں معیار کی باتیں مت کر

مدت کے بعد آئینہ دیکھا تو ڈر گیا
میں خود سے پوچھنے لگا یہ کیا ہوا مجھے

جیسے کہ میں تحریر کر چکا ہوں کہ سلیم صدیقی کے یہاں سہل ممتنع میں ایسے بہت سے اشعار ہیں کہ جو قاری کو چونکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اب اس آخری شعر کو دیکھئے کہ مدت کے بعد آئینے کو دیکھ کر خود کیوں محسوس ہوا۔ ظاہر ہے کہ حساس انسان آئینے میں صرف اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھتا بلکہ آئینہ بیں کی پشت بھی اسے آئینے میں نظر آتی ہے۔ یعنی آئینے میں اپنے ہی خدو خال نہیں، بلکہ پورا معاشرہ نظر آتا ہے۔ سلیم حساس انسان بھی ہیں اور حساس شاعر بھی، اسی لئے وہ آئینے کو دیکھ کر خوف زدہ ہیں۔

سلیم صدیقی کی شعری کائنات میں ہنگامی اور وقتی مسائل ہی موضوع سخن نہیں ہیں، بلکہ اس میں ان کے تجربات و مشاہدات بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں اعلیٰ وارفع ذات و کائنات کے اشارے ملتے ہیں، لیکن وہ اس پر قائم نہیں رہ پاتے یہ ان کی صحافتی مجبوری ہو سکتی ہے

۔ سلیم کے یہاں جمالیات کا رنگ بھی بڑا نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ محبوب کے تعلق سے ان کے یہاں ایک خاص طرح کی عقیدت واحترام ان کے اشعار کو ایک عجیب سی معنویت عطا کرتا ہے۔ مثلاً:

لمحہ نہیں ہوں، سال نہیں ہوں، صدی نہیں
آجاؤں گا پلٹ کے اگر تم پکار لو

وہ سامنے تھا اور اس کو نگاہ چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی کہ حوصلے کم تھے

اٹھو اور موت سے نظریں ملاؤ
اگر جینے کی خواہش ہو رہی ہے

وہ بھی خاموش ہم بھی چپ چپ تھے
کہہ گئے پھر بھی دونوں دل کی بات

بہر حال سلیم صدیقی کی شاعری مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے دور حاضر کے مسائل سے گزر کر دنیا کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتی نظر آتی ہے، جس میں ان کے فکر کی خوشبو قاری کے ذہن و دل کو معطر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اور اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

سرمایہ داروں کی راتیں دن سے بھی اجیاری ہیں
نادار و مفلس کے گھر میں دن میں بھی ہے اندھیرا بابا

لمحہ لمحہ کون مرے کردار پہ پہرا دیتا ہے
میرے اندر چھپ کر مجھ کو دیتا ہے آوازیں کون

یاروں کو ہمدرد سمجھ
دل کی بات بتانا مت

بیٹے بوجھ سمجھتے ہیں اب ماؤں کو
کیسے کہہ دوں خون کے رشتے سچے ہیں

میرا دعویٰ ہے وہ خلعت پائے گا
خود داری جو گھر پر رکھ کر آئے گا

حق گوئی کی بات پر آج
صوفی ، سنت ، قلندر چپ

میں سمجھتا ہوں کہ سلیم صدیقی کی شاعری میں دور حاضر کے کرب کے علاوہ نستعلیق آداب زندگی، بزرگوں کا احترام، مذہبی اقدار، حوصلہ، ہمت اور وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو قاری کے ذہن و دل کو متاثر کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اسی لئے میں سلیم صدیقی کو ان کے مجموعہ کلام ’قلندر بولتا ہے‘ کی اشاعت پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خدا کے حضور دعا کرتا ہوں کہ ان کا مجموعہ خواص وعوام میں شرف قبولیت کی سند حاصل کرے، آمین۔

✿

اللہ باقی

جب کچھ نہ تھا
تب تو تھا

جب
کچھ نہ ہوگا

تب
تو ہوگا

یہ ذرّے
یہ آفتاب و مہتاب
یہ سرسبز و بنجر زمین
یہ سمندر
یہ دریا یہ جھیل
نیلا آکاش
برف کے یہ پہاڑ
تمام
جن و بشر

اور تمام حیوانات
غرض کہ کائنات
یہ روشنی یہ اندھیرا
یہ پانی اور ہوا
یہ اڑتے ابر کے ٹکڑے
یہ دھند
اور یہ دھواں
سوائے تیری ذات
ہر ایک شئے
لوٹ کے جانی ہے اپنے محور پر
مرا یقین ہے کامل
کہ کل نہ کچھ ہوگا
ہر ایک شئے کا یہاں پر
فنا مقدر ہے
فقط اک نام ہے تیرا
سو، بس وہی
رہے گا باقی

عشق کی دولت

زباں کو یہ مری ندرت ملی ہے
کہ ایک اک لفظ کو عزت ملی ہے
سلیم اس واسطے خوش ہو رہا ہوں
نبیؐ کے عشق کی دولت ملی ہے

اے خدایا

بخشا ہے محمدؐ کو شرف جیسا خدا نے
وہ رتبہ کسی اور نبی نے کہاں پایا
پوچھا جو خدا نے کہ بتا تیری رضا کیا
فرمایا کہ بس بخش دے اُمت کو خدایا

جشنِ مصطفیٰؐ

تیرہ شبی میں کوئی کرن نور کی ملی
آپؐ آئے تو جہان کو اک روشنی ملی
یہ جشنِ مصطفیٰؐ کا ہے انعام مومنو!
صلِ علیٰ کا ورد کیا ہر خوشی ملی

رحمۃ للعالمین

یا محمدؐ مصطفٰے یا رحمۃ للعالمین
یا حبیب کبریا یا رحمۃ للعالمین

آپؐ کی اُمت کے خواہشمند موسیٰ بھی ہوئے
یا شہ ہر دوسرا یا رحمۃ للعالمین

جس نے دنیا کو بتایا کفر کیا، ایماں ہے کیا
آپؐ ہیں وہ حق نما یا رحمۃ للعالمین

مجھ حقیر و ناتواں پر بھی کرم فرمایئے
شافع روز جزا یا رحمۃ للعالمین

عرش پر بلوا کے دی معراج کامل کی سند
ہے فِدا تم پر خدا یا رحمۃ للعالمین

ہے زیارت روضۂ اقدس کی ارمانِ سلیم
بس یہی ہے مدعا یا رحمۃ للعالمین

غزلیات

❖

اس کی یادوں کا اک سلسلہ رہ گیا
زندگی کا یہی آسرا رہ گیا

سامنے میری دنیا اُجڑتی رہی
اور میں تھا کہ بس دیکھتا رہ گیا

گھٹ گئیں ساری نزدیکیاں دفعتاً
کچھ رہا تو فقط فاصلہ رہ گیا

ہم سفر چل دیا اپنی راہوں پہ جب
ساتھ میرے مرا راستہ رہ گیا

بے بسی، بے قراری و دیوانگی
زیست میں اب مری اور کیا رہ گیا

بے وفائی کے اس دور میں اے سلیم
اب وفا کا تو بس نام سا رہ گیا

◆

املاک کیا بٹی ہے کہ جذبات بٹ گئے
محسوس ہو رہا ہے مرے ہاتھ کٹ گئے

اک پل سکون ہم کو میسر نہ ہوسکا
شہرت کے سانپ جب سے بدن پر لپٹ گئے

اب سائبان کون بنے راہگیر کا
جو سایہ دار تھے وہ شجر سارے کٹ گئے

اِترا رہے تھے لوگ سہاروں پہ کس قدر
سورج جو سر پے آیا تو سایے بھی گھٹ گئے

کب تک رہے گا قید انا کے حصار میں
معلوم بھی ہے تجھ کو زمانے پلٹ گئے

ماں باپ کی نصیحتیں سب رائیگاں گئیں
بچے جوان کیا ہوئے آنگن سمٹ گئے

منصف کا کیا قصور ہے قانون کیا کرے
سارے گواہ وقتِ گواہی پلٹ گئے

مجبوریاں تھیں وقت کی کچھ اس لیے سلیم
ہم بھی حصارِ ذات کے اندر سمٹ گئے

❖

پریم پجاری دل کو میرے تحفہ یہ انمول دیا
اس نے چاہت کے پیالے میں وِش نفرت کا گھول دیا

کیسی قسمیں، کیسے وعدے اور کیسا پیمانِ وفا
پیار کو میرے دولت کی میزان پہ اس نے تول دیا

کب تک تنہا تنہا جیتے کب تک دل کو سمجھاتے
جسم سے اپنے باندھا تھا جو سانس کا بندھن کھول دیا

اس سے اچھا تھا بک جاتے ہم بھی سستی قیمت میں
ہم نے اپنا فن دنیا کو بے بھاؤ، بے مول دیا

آہیں، آنسو، یاس، کسک، بے تابیٔ دل اور محرومی
میرے دلبر نے مجھ کو یہ میرے دل کا مول دیا

گلیوں گلیوں، شہروں شہروں کس نے آگ لگائی ہے
بغض و نفرت کا دنیا کو کس نے یہ ماحول دیا

دل میں اک ہلچل سی بپا ہے نس نس میں ہیجان سلیم
جانے کس نے کان میں آ کے خوشیوں کا رس گھول دیا

◆

پرکشش تہذیبِ نو کی یہ ستم کاری بھی دیکھ
چند سکّوں کے عوض بکتی ہوئی ناری بھی دیکھ

تیری غیروں سے شکایت حق بجانب ہے مگر
اپنے کچھ مخصوص یاروں کی وفاداری بھی دیکھ

آڑ میں امداد کے شہرت بھی ہے پیشِ نظر
آج کے زردار کا معیارِ زرداری بھی دیکھ

اے مرے معصوم بھائی کھوکھلے وعدوں کے ساتھ
جو پسِ پردہ ہے، رہبر کی وہ مکاری بھی دیکھ

باپ سے کہتے ہیں بچّے جلد واپس لوٹنا
یہ سمجھ، یہ عقل، یہ بچوں کی ہشیاری بھی دیکھ

رہبرِ ہندوستاں تجھ کو اگر فرصت ملے
نوجوانانِ وطن کی بڑھتی بے زاری بھی دیکھ

جو امینِ عظمتِ کردار ہوتے ہیں سلیم
ان کے چہروں پر لکھی تحریرِ ناداری بھی دیکھ

◆

دنیا کے ماحول میں کیسی گھول رہے ہیں نفرت لوگ
حرص و ہوس اور جنگ وجدل کی پھیلاتے ہیں بدعت لوگ

اب کوئی غم خوار ہمارا اور نہ کوئی پرساں ہے
پھر بھی دنیا میں زندہ ہیں ہم جیسے بے غیرت لوگ

یہ بھی کیسا دور آیا ہے قدریں سب پامال ہوئیں
دولت کی میزان پہ اب تو، تول رہیں ہیں عزت لوگ

اپنی خود غرضی کی خاطر مذہب کا ہتھیار لیے
بستی بستی گلیوں گلیوں بانٹ رہے ہیں نفرت لوگ

دولت کی چادر نے ان کے سارے عیب چھپائے ہیں
چور، لٹیرے، قاتل اب تو بن بیٹھے با عزت لوگ

اس دنیا میں دوست کسی کا اب کوئی ہمراز کہاں
خود اپنے سے آپ چھپائیں اب تو دل کی حالت لوگ

نفرت کے شعلوں میں جل گئی اپنے پن کی ریت سلیم
بھول چکے ہیں اب وہ سارے پچھلے میل، مروت لوگ

⁂

جب اس کی گرم نگاہی کے وار پیہم تھے
دلِ برہنہ لیے سامنے فقط ہم تھے

وہ دل کو آج مرے پاش پاش کرتے ہیں
کبھی جو لفظ مرے زخم دل کا مرہم تھے

نہ جانے آج کہاں کھو گئے وہ چہرے تمام
جو میری زیست کا محور تھے، میرے ہمدم تھے

وہی کہ جس نے سدا حوصلہ بڑھایا تھا
چراغ اس کی نگاہوں کے آج مدھم تھے

بکھیرتا تھا جو محفل میں قہقہے ہر سو
اس ایک شخص کے سینے میں کس قدر غم تھے

وہ سامنے تھا اور اس کو نگاہ چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی، کہ حوصلے کم تھے

◆

کوئی آسودگی دیکھی نہ پائی ہے خوشی میں نے
گزاری ہے ہمیشہ مشکلوں میں زندگی میں نے

زمانے کی کوئی دولت مجھے بہکا نہیں سکتی
'ہزاروں بار ٹھکرایا ہے تاجِ خسروی میں نے'

نہ لب پر نام ہی آیا نہ دل میں آرزو مچلی
نئے انداز سے کی ہے کسی کی بندگی میں نے

نہ دل دیتا، نہ غم ملتا، نہ آنکھیں میری نم ہوتیں
سنواری ہے خود اپنے آپ اپنی زندگی میں نے

پڑوسی کو بچانے میں، میں اپنا گھر جلا بیٹھا
گنوا کے اپنا سرمایہ نبھائی دوستی میں نے

لب و رخسار سے میں نے کبھی رغبت نہیں رکھی
زمانے کے تقاضوں پر ہی کی ہے شاعری میں نے

سلیمؔ اس روز سے میں راہزن تک سے پشیماں ہوں
کہ جب سے آزمائی ہے کسی کی رہبری میں نے

❖

جب اس کی گرم نگاہی کے وار پیہم تھے
دلِ برہنہ لیے سامنے فقط ہم تھے

وہ دل کو آج مرے پاش پاش کرتے ہیں
کبھی جو لفظ مرے زخم دل کا مرہم تھے

نہ جانے آج کہاں کھو گئے وہ چہرے تمام
جو میری زیست کا محور تھے، میرے ہمدم تھے

وہی کہ جس نے سدا حوصلہ بڑھایا تھا
چراغ اس کی نگاہوں کے آج مدھم تھے

بکھیرتا تھا جو محفل میں قہقہے ہر سو
اس ایک شخص کے سینے میں کس قدر غم تھے

وہ سامنے تھا اور اس کو نگاہ چھو نہ سکی
یہ احترام کی حد تھی، کہ حوصلے کم تھے

❖

کوئی آسودگی دیکھی نہ پائی ہے خوشی میں نے
گزاری ہے ہمیشہ مشکلوں میں زندگی میں نے

زمانے کی کوئی دولت مجھے بہکا نہیں سکتی
’ہزاروں بار ٹھکرایا ہے تاجِ خسروی میں نے‘

نہ لب پر نام ہی آیا نہ دل میں آرزو مچلی
نئے انداز سے کی ہے کسی کی بندگی میں نے

نہ دل دیتا، نہ غم ملتا، نہ آنکھیں میری نم ہوتیں
سنواری ہے خود اپنے آپ اپنی زندگی میں نے

پڑوسی کو بچانے میں، میں اپنا گھر جلا بیٹھا
گنوا کے اپنا سرمایہ نبھائی دوستی میں نے

لب و رخسار سے میں نے کبھی رغبت نہیں رکھی
زمانے کے تقاضوں پر ہی کی ہے شاعری میں نے

سلیم اس روز سے میں راہزن تک سے پشیماں ہوں
کہ جب سے آزمائی ہے کسی کی رہبری میں نے

◆

کہیں پہ موت رقصاں ہے کہیں چھلکے ہیں پیمانے
زمانہ کیسے بھولے گا یہ عبرت ناک افسانے

ہمیشہ دوستوں سے زخم کھائے ہیں، مگر پھر بھی
نہ جانے عقل کب آئے گی ہم کو یہ خدا جانے

ہماری مفلسی نے ہم کو بھی کیا دن دکھائے ہیں
جو کل تک ہمنوا تھے اب نظر آتے ہیں بے گانے

نہ جانے اور کب تک امتحانوں سے گزرنا ہے
ہماری مشکلوں کا دور ہوگا ختم کب جانے

چھلک جاتے ہیں اکثر آپ خود میکش کے ہاتھوں سے
ہے کس میں ظرف کتنا خوب جانے ہیں یہ پیمانے

سنا ہے تخت شاہی ٹھوکروں میں اپنی رہتے تھے
کبھی ہوگی حقیقت آج تو لگتے ہیں افسانے

سلیم آئی ہے ہم کو راس یہ دیوانگی کیسی
کہ سنگ و خشت لے کر ہاتھ میں آئے ہیں فرزانے

❖

منزل کا کچھ نشان نہیں کچھ خبر نہیں
اس پر ستم یہ ہے کہ کوئی ہم سفر نہیں

ہے تو وہ میری روح، مرے دل کے آس پاس
یہ اور بات اس کو مری کچھ خبر نہیں

کیا کیا سناتے آپ کو فرصت ہی کب ملی
یہ داستانِ رنج و الم مختصر نہیں

تیرہ شبی ہی تیرہ شبی تاحد نظر
شاید مرے نصیب میں کوئی سحر نہیں

ہاں راہِ شوق میں، میں ترے ساتھ ساتھ ہوں
جانا مگر کہاں ہے یہ مجھ کو خبر نہیں

کہنے کو ہم سے ان کو ملے مدتیں ہوئیں
پروازِ دل سے پھر بھی مرے دور تر نہیں

بے چین ہو اُٹھیں مری آہوں سے وہ سلیم
آہوں میں میری آج تو اتنا اثر نہیں

◆

چاروں طرف ہے آہ و فغاں آگ لگ گئی
ہر سمت اُٹھ رہا ہے دھواں آگ لگ گئی

کیا پوچھتے ہو دوستو! اب قصۂ حیات
سونا پڑا ہے دل کا مکاں آگ لگ گئی

الفت، خلوص و مہر و وفا، اعتبار کا
باقی رہا نہ کوئی نشاں آگ لگ گئی

ماتم بپا ہے صحنِ گلستاں میں آج کل
ہر سمت ہے خزاں ہی خزاں آگ لگ گئی

اے رہنماؤ! تم ہی ہو امنِ وطن پہ داغ
جب جب کھلی تمہاری زباں آگ لگ گئی

نفرت کی آندھیوں نے نگر کر دیا کھنڈر
ہے ہر طرف دھواں ہی دھواں آگ لگ گئی

ہر شخص آج اپنے مسائل میں قید ہے
اب کوئی چارہ ساز کہاں آگ لگ گئی

◆

ملتے ہی نظریں قیامت ہوگئی
کیا کہوں کیا دل کی حالت ہوگئی

کھو گیا دل کا مرے صبر و قرار
اک نظر ان کی قیامت ہوگئی

زندگی بھر بے رُخی سے پیش آئے
آج کیوں مجھ پر عنایت ہوگی

زندگی مثلِ بیابانِ الم
کیا کہوں کس کی بدولت ہوگئی

نفرتوں کا زہر ہم نے کیا پیا
ساری دنیا کو شکایت ہوگئی

کوڑیوں میں بک گئی جنسِ وفا
کس قدر سستی محبت ہوگئی

تم نے تو لب سی لیے تھے پھر سلیم
کس طرح تشہیر الفت ہوگئی

❖

اس کو احساس یہ ہوا تو نہیں
وہ بشر ہے کوئی خدا تو نہیں

لاکھ تدبیریں ہم نے کیں لیکن
لکّھا تقدیر کا مٹا تو نہیں

ڈوبتے کو ہے ایک تنکا بہت
پھر بھی محکم یہ آسرا تو نہیں

مطمئن کیوں ہے چارہ گر اپنا؟
درد کم ہے مگر مٹا تو نہیں

التفات اور وہ کریں مجھ پر
دل کو دھوکہ کوئی ہوا تو نہیں

خوف کھاؤں میں کس لیے تجھ سے
تو بھی انسان ہے خدا تو نہیں

جو قدم بھی اُٹھاؤ اس پہ سلیم
سوچ لو سوچنا برا تو نہیں

❖

مرے لب پر تبسم اب کہاں ہے
کسک ہے، نالۂ غم ہے، فغاں ہے

نہ ٹوٹا ٹھیس کھا کر شیشۂ دل
خدا جانے یہ کتنا سخت جاں ہے

زمانہ ہوگیا ہے تجھ کو گزرے
ترے چرچے ہیں، تیری داستاں ہے

جلا کر مضطرب ہے میرا گھر اب
مرا صیاد کتنا مہرباں ہے

نئے شہروں کی سڑکیں بھی نئی ہیں
برائے نام سر پر سائباں ہے

کہاں جائیں غمِ الفت کے مارے
نہ کوئی در نہ کوئی آستاں ہے

سلیم اب کون کس کا درد بانٹے
کسی کو آج کل فرصت کہاں ہے

❖

ہم تو جب بھی ملے خوشی سے ملے
وہ مگر ہم سے بے رُخی سے ملے

اس طرح اپنی زندگی سے ملے
جیسے اُڑتی گھٹا 'ششی' سے ملے

آ نہ جائے دلوں میں فرق کہیں
اس سے کہہ دو ذرا کمی سے ملے

جب کبھی وقت پڑ گیا ہم پر
دوست بھی اپنے بے رُخی سے ملے

عشق کی ہم نے آبرو رکھ لی
ہم ترے بعد کب کسی سے ملے

ناز تھا جن کی دوستی پہ سلیم
آج وہ بھی تو اجنبی سے ملے

❖

آئی کسی کی یاد تو رنجور ہوگیا
میں اپنے آپ سے بھی بہت دور ہوگیا

محفل میں چھڑ گیا جو وفاؤں کا تذکرہ
چہرہ تمہارا کس لیے بے نور ہوگیا

کس کس سے بے وفائی کا اب کیجئے گلہ
اب یہ سلوک دہر کا دستور ہوگیا

محرومیوں نے میری کیا ہے مجھے اسیر
دنیا سمجھ رہی ہے کہ مغرور ہوگیا

میرے اصول مجھ کو کبھی کچھ نہ دے سکے
اس کے سوا کہ بکنے پہ مجبور ہوگیا

اپنی انا کو مار لیا آپ کے لیے
میں یہ ستم بھی سہنے پہ مجبور ہوگیا

آلامِ روزگار نے فرصت نہ دی سلیم
یوں اپنی ذات سے بھی بہت دور ہوگیا

◆

ماحول فسادات کا تیار نہ کر دے
یہ کام کہیں پھر کوئی اخبار نہ کر دے

دشمن سے نہیں خوف مجھے یار کا ڈر ہے
پیچھے سے اچانک وہ کہیں وار نہ کر دے

خدشہ ہے کہ کم ظرف سے یہ اپنا تعلق
بدنام کسی دن سرِ بازار نہ کر دے

لازم ہے کہ اب سر سے کفن باندھ کے نکلو
دشمن کا بھروسہ نہیں، یلغار نہ کر دے

یہ دور صداقت کا طلب گار نہیں ہے
حق گوئی کہیں نذرِ سرِ دار نہ کر دے

بھائی مجھے یہ ڈر ہے کہ ہر روز کا جھگڑا
اس گھر میں کھڑی پھر نئی دیوار نہ کر دے

◆

ہم سے یہ دشمنی نہ کی جائے
زندگی کی دُعا نہ دی جائے

کوئی ہمدم نہ غمگسار کوئی
کس سے روودادِ غم کہی جائے

دوست ہنستے ہیں حال دل سن کر
بات دل کی نہ اب کہی جائے

دوستوں پر ہی اکتفا کیوں ہو
دشمنوں کی بھی کچھ سنی جائے

ایک سقراط کی ضرورت ہے
نفرتوں کا جو زہر پی جائے

وقت سے ہم نے یہ سبق سیکھا
دوستوں سے مدد نہ لی جائے

شمع تہذیب بجھ رہی ہے سلیمؔ
روشنی دل جلا کے کی جائے

❖

کبھی جو تفرقہ بوتا نہیں ہے
وہ اپنوں کو کبھی کھوتا نہیں ہے

سحر کی فکر میں مزدور اکثر
سنا ہے رات بھر سوتا نہیں ہے

ستارے توڑ لانا دل بچھانا
کہا جاتا تو ہے، ہوتا نہیں ہے

مرا بچہ سیانا ہے ابھی سے
کھلونوں کے لیے روتا نہیں ہے

ہزاروں غم مرے دل میں مکیں ہیں
ترا غم ہی تو اکلوتا نہیں ہے

یہ کیسا دور آیا ہے کہ قاتل
لہو شمشیر سے دھوتا نہیں ہے

سلیم اس دورِ نو میں اب کوئی بھی
کسی کے بوجھ کو ڈھوتا نہیں ہے

❖

چلتے چلتے یہ مانا کہ تھک جائیں گے
یہ نہ سمجھو کہ رستہ بھٹک جائیں گے

جو سنے گا مری داستانِ الم
اس کی آنکھوں کے ساغر چھلک جائیں گے

اے چمن موسمِ گل کو آنے تو دے
اُن کی یادوں کے غنچے چٹک جائیں گے

منزلِ زندگی کی مسافت نہ پوچھ
چلتے چلتے ترے پاؤں تھک جائیں گے

جن کی رفتار دنیا میں ہے معتدل
وہ یقیناً بہت دور تک جائیں گے

ہم سے ملنے تو آئے نہ آئے مگر
آخری سانس تک، راہ تک جائیں گے

اے سلیم آج ان کا نہ تم نام لو
ورنہ آنکھوں سے آنسو چھلک جائیں گے

◆

آج ناساز ہیں بہت حالات
شہر میں پھر رہے ہیں حیوانات

جانے کس لمحہ گھر اُجڑ جائے
رات دن مجھ کو ہیں یہی خدشات

قدر و قیمت نہیں محبت کی
بک گئے کوڑیوں میں سب جذبات

جب بھی یادوں کی چھا گئی بدلی
ہوگئی غیر موسمی برسات

وہ بھی خاموش ہم بھی چپ چپ تھے
کہہ گئے پھر بھی دونوں دل کی بات

داد کچھ اس طرح ملی فن کی
کٹ گئے اہلِ فن کے دونوں ہات

کوئی سایہ نہیں ہے خوشیوں کا
جانے کب ختم ہوں گے یہ صدمات؟

❖

چار سو پھر بھی دلکشی ہوگی
ہم نہ ہوں گے تو کیا کمی ہوگی

دشمنی پر تو ان کی مرتے ہیں
اور جب ان سے دوستی ہوگی؟

تیرگی ایسے چھٹ نہیں سکتی
دل جلاؤ تو روشنی ہوگی

ان سے ترکِ تعلقات کے بعد
کیسی ویران زندگی ہوگی

ذہن و دل ہی نہیں ٹھکانے پر
خاک ایسے میں شاعری ہوگی

❖

عارضی آسائشوں کی چاہ کرنا چھوڑ دے
فکرِ عقبیٰ ذہن میں رکھ، فکرِ دنیا چھوڑ دے

کچھ عمل کا ذکر کر کچھ بات کر کردار کی
قیصر و کسریٰ کا اب تو خواب بننا چھوڑ دے

کشتیاں بھی بادبانوں کی نہیں محتاج اب
عارضی ہو جو سہارا وہ سہارا چھوڑ دے

زندگی اندوہِ غم میں گھٹ کے رہ جائے اگر
جذبۂ غم آنسوؤں کی شکل بہنا چھوڑ دے

وصل کا وعدہ کیا ہے تو اسے پورا بھی کر
یہ نیا ہر روز کا حیلہ بہانا چھوڑ دے

ایک دن تو دل کو بھی ترجیح دے کر دیکھ لوں
عقل سے کہہ دو کہ مجھ کو آج تنہا چھوڑ دے

کاش آ جائے پلٹ کر وہ سنہرا دور پھر
بھائی، بھائی کے لیے منہ کا نوالا چھوڑ دے

اپنے ہاتھوں سے کمانے کی لگن دل میں نہیں
چاہتا ہے آج بیٹا، باپ ورثا چھوڑ دے

دیکھ کھا جائیں نہ آہیں بے کس و مظلوم کی
اے امیر شہر اب بھی ظلم ڈھانا چھوڑ دے

ملک کی گلیاں لہو پینے کی عادی ہو نہ جائیں
یہ تعصب زہر کا ذہنوں میں بھرنا چھوڑ دے

مذہبی جذبات کے سارے پٹارے بند کر
اے سیاست کے مداری یہ تماشا چھوڑ دے

چاند کو چھونے کی کوشش احمقانہ فعل ہے
''جو نہ حاصل ہو سکے اس کی تمنا چھوڑ دے''

تا قیامت یاد رکھے تجھ کو یہ دنیا سلیم
اپنے کردار و عمل کا نقش ایسا چھوڑ دے

❖

کتنے زخموں سے اب چور ہے زندگی
سچ تو یہ ہے کہ ناسور ہے زندگی

ایک بھی سانس خود اس کے بس میں نہیں
دیکھئے کتنی مجبور ہے زندگی

ہے کہیں رنج و غم، یاس و حسرت، الم
اور کہیں شاد و مسرور ہے زندگی

کوئی آسودگی ہے، نہ دل مطمئن
یعنی مجھ سے بہت دور ہے زندگی

آج دنیا ہے بارود کے ڈھیر پر
کس قدر آج معذور ہے زندگی

جب بھی چاہے گی دامن جھٹک جائے گی
میں سمجھتا ہوں مغرور ہے زندگی

کچھ پتہ ہو تو تم ہی بتا دو سلیم
ایک مدت سے مفرور ہے زندگی

◆

ہر دم دل آزاری ہے
قدم قدم مکاری ہے

سناٹا سا طاری ہے
چلنے کی تیاری ہے

جاناں تیری فرقت کا
لمحہ لمحہ بھاری ہے

زرداری ہے اک لعنت
غربت بھی بیماری ہے

شہر دل میں جانے کیوں
ہُو کا عالم طاری ہے

خود سے بھی ناراض رہیں
یہ کیسی خودداری ہے

قسطوں میں جینا مرنا
ہم سب کی لاچاری ہے

حق کہنا، حق پر چلنا
جرم ہے اب غداری ہے

◆

کہیں دولت کے آجانے سے آتی ہے شرافت کیا
کسی بازار میں بکتی ہوئی دیکھی ہے عزت کیا

قلم چلنے لگیں جب مصلحت کی روشنائی سے
تو پھر جھوٹی ہوں تحریریں تو اس پر یار حیرت کیا

جہاں منشی سے منصف تک بھی بکتے ہوں سکّوں میں
تو پھر انصاف ہو کیسے کرے گی پھر عدالت کیا

دلوں کو توڑ کر ووٹوں کی فصلیں کاٹ لینا ہے
ہمارے دور میں اس کے سوا ہے اور سیاست کیا

ہمارے شہر میں ہر شئے کی اک قیمت مقرر ہے
سیاست کیا، صحافت کیا، وزارت کیا، عدالت کیا

یہاں انسان کا ناحق لہو سڑکوں پہ بہتا ہے
یہ جنگل راج ہے اس راج میں جانوں کی قیمت کیا

سلیم اس سے شرافت کی بھلا اُمید کیوں تم کو
بدلتی ہے بدلنے سے کبھی حیواں کی فطرت کیا

◆

لٹ گیا صبر و سکوں چند ہی لمحات کے بعد
شہر میں کچھ نہ بچا اب کے فسادات کے بعد

تم نے سوچا تھا ہمیں جگ سے مٹا دو گے مگر
حوصلے اور بڑھے ہیں نئی آفات کے بعد

چارہ گر کوئی نہ ہمدرد و مسیحا اپنا
ہم کو اندازہ ہوا تنگیٔ حالات کے بعد

راس آئی نہ کبھی ہم کو زمانے کی خوشی
آپ کی بخشی ہوئی درد کی سوغات کے بعد

ایک ہی پل میں بدل جاتے ہیں رشتے کیسے
آج محسوس ہوا ان سے ملاقات کے بعد

کبھی غدار کبھی موردِ الزامِ جفا
یہ صلے ہم کو ملے ملک کی خدمات کے بعد

بس اسی آس پہ زندہ ہیں یہاں لوگ سلیم
صبح بھی ہوگی کبھی غم کی سیہ رات کے بعد

◆

پورب، پچھم، اُتر، دکھن نکلا سرخ سویرا بابا
لیکن غم کے ماروں کی دنیا ہے صرف اندھیرا بابا

آج جو تجھ پر وقت پڑا تو اس نے بھی منہ موڑ لیا
یعنی آج نہیں ہے وہ بھی جو تھا کل تک تیرا بابا

سرمایہ داروں کی راتیں دن سے بھی اجیاری ہیں
نادار و مفلس کے گھر میں دن میں بھی ہے اندھیرا بابا

قافلہ وہ منزل تک پہنچے ایسا تو اب نا ممکن ہے
جس کا رہبر خود بن جائے رہزنِ، چور، لٹیرا بابا

خون جگر سے جس کا ہم نے پتہ پتہ سینچ دیا ہے
آج اسی گلشن پر کوئی تیرا حق نہ میرا بابا

خون جگر ہے جس کا شامل گلشن کی رنگینی میں بھی
آخر اس کی دنیا میں ہے کیوں خونخوار اندھیرا بابا

منزل تک اب تیرا پہنچنا ٹھہرا تیری قسمت پر
ڈھل گیا سورج، ڈوب گیا دن، چھایا گھور اندھیرا بابا

آس لگائے دروازے پر ہم بھی اب بیٹھے ہیں سلیم
دیکھیں چاند کا کب ہوتا ہے اپنے گھر میں پھیرا بابا

◆

نسلوں کے ذہنوں سے بھلائے دورِ ستم کی یادیں کون
دیکھیں اب مسمار کرے یہ نفرت کی دیواریں کون

اب وہ پہلے جیسی چاہت پہلے سے جذبات کہاں
تارے گن کر اب کاٹے ہے ہجر کی لمبی راتیں کون

آہیں، آنسو، یاس، کسک، بے تابیٔ دل اور محرومی
جانے مجھ کو بخش گیا ہے پیار کی یہ سوغاتیں کون

یہ تو دیکھا یکجہتی کا دامن کس نے چاک کیا
یہ بھی دیکھیں یکجہتی کی رکھتا ہے بنیادیں کون

لمحہ لمحہ کون مرے کردار پہ پہرا دیتا ہے
میرے اندر چھپ کر مجھ کو دیتا ہے آوازیں کون

دورِ حاضر حق گوئی کی نعمت سے محروم ہوا
خود غرضی ایمان ہوئی ہے کھولے آج زبانیں کون

اپنا مقصد نوع انساں کو انسان بنانا ہے
ہم بھی دیکھیں ہم سے اونچی بھرتا ہے پروازیں کون

منصف سارے اندھے بہرے، حاکم بے ایمان سلیم
ہم جیسے لاچاروں کی اب سنتا ہے فریادیں کون

◆

غم ہیں لپٹے ہوئے یوں مجھ سے بلاؤں کی طرح
جیسے چندن پہ کئی سانپ لتاؤں کی طرح

روٹھ جاتی ہے کبھی مجھ پہ فدا ہوتی ہے
میری قسمت ہے حسینوں کی اداؤں کی طرح

تلخیاں بھر دے جو آ جائے رقیبوں میں کہیں
اپنا تو نام بھی کڑوا ہے دواؤں کی طرح

ان کی تقدیر انہیں عیش و مسرت حاصل
ہم نے کاٹے ہیں شب و روز سزاؤں کی طرح

کچھ نہ دے پائیں گے یہ لاکھ پرستش کرلے
پوجتا کیوں ہے تو پتھر کو خداؤں کی طرح

ان کی تعریف میں الفاظ کہاں سے لاؤں
آنکھ میخانہ ہے اور زلف گھٹاؤں کی طرح

اب تو ممکن نہیں بیماریٔ دل کا بھی علاج
چارہ گر زہر پلاتے ہیں دواؤں کی طرح

اب کوئی دل میں نہ آتا ہے نہ جاتا ہے سلیم
دل کہ ویران ہے مرگھٹ کی فضاؤں کی طرح

◆

ہر ایک زخمِ محبت جواں ہے اب کے برس
مجھے سکون میسر کہاں ہے اب کے برس

وہ شوخیاں وہ تبسم کہاں ہے اب کے برس
تمام شہر ہی محوِ فغاں ہے اب کے برس

اسی لیے تو ہر اک سمت خشک سالی ہے
نصیبِ دشمنِ جاں آسماں ہے اب کے برس

اُٹھا رہا ہوں قدم اس لیے میں ڈر ڈر کر
قدم قدم پہ مرا امتحاں ہے اب کے برس

کوئی نوید مسرت نہ قہقہے نہ ہنسی
بھری بہار بھی جیسے خزاں ہے اب کے برس

خدا ہی خیر کرے ناخدا تو ہے مایوس
بھنور میں کشتیِ ہندوستاں ہے اب کے برس

سلیم تلخ کلامی ہے سب کے ہونٹوں پر
خلوص، پیار تو جیسے دھواں ہے اب کے برس

⁂

ہیں درد میں سکون کی رعنائیاں بہت
کام آ رہی ہیں زخم کی گہرائیاں بہت

یاروں کی خصلتوں میں تھیں مکاریاں بہت
پھر بھی نبھائیں ہم نے وفاداریاں بہت

فن سمجھا جا رہا ہے تھرکتا ہوا بدن
بھاتی ہیں اب جہاں کو اداکاریاں بہت

کیسے کھلی ہوا میں کوئی سانس لے سکے
کم ہوگئیں مکانوں کی انگنائیاں بہت

تنہائی، رات، یادیں، قلم اور ڈائری
مشقِ سخن کو ہیں یہی تیاریاں بہت

تعمیرِ آشیاں کے عزائم تو ہیں مگر
حائل ہیں اپنی راہ میں دشواریاں بہت

اب محفلیں طواف ہمارا کریں تو کیا
جب راس آگئیں ہمیں تنہائیاں بہت

بچے جوان جب سے ہوئے ماں کو ہے ملال
سونی سی گھر کی ہوگئیں انگنائیاں بہت

گُم نام تھے تو زیست بہت پر سکون تھی
دُکھ دے رہی ہیں ہم کو شناسائیاں بہت

کیسے یقین کرلیں بھلا اس کے قول کا
دیکھی ہیں ہم نے جس کی ریاکاریاں بہت

وہ ہو چکا ہے وقت کی تاریکیوں میں گُم
کرتا تھا جو سلیم ضیا باریاں بہت

◆

خیال و فکر کی جب بندشوں سے گزرے ہیں
قلم ہمارے بہت الجھنوں سے گزرے ہیں

کبھی وصال کی چاہت کبھی فراق کا غم
محبتوں میں عجب الجھنوں سے گزرے ہیں

ہمیں نشانہ بنے ہیں ستم کے تیروں کا
ہر ایک دور میں ہم آفتوں سے گزرے ہیں

شکن نہ ماتھے پہ آئے قریب پا کے ہمیں
اسی خیال سے ہم فاصلوں سے گزرے ہیں

تمھیں سنائیں اگر حال تو لرز اُٹھو
ہم ایسے ایسے کٹھن مرحلوں سے گزرے ہیں

جہاں نے ہم کو بہت روکا حق بیانی سے
ہم اپنے آپ پریشانیوں سے گزرے ہیں

جہاں نہ سایہ، نہ پانی، نہ کوئی جائے اماں
تلاشِ حق میں عجب راستوں سے گزرے ہیں

❖

مجھ کو اس بات کا بڑا غم ہے
قد مرا میرے سایے سے کم ہے

کس لیے آنکھ تیری پُر نم ہے
بے وفا کیا تجھے مرا غم ہے

آنے والا ہے کوئی طوفاں اب
شور ساحل پہ آج کچھ کم ہے

بے بسی اضطراب و محرومی
ہر طرف زندگی کا ماتم ہے

اب پریشاں ہے دیکھئے جس کو
چار سو بے کسی کا عالم ہے

اپنے چھپر سنبھال کر رکھنا
ان دنوں آندھیوں کا موسم ہے

وقت کا انتظار ہے ہم کو
لوگ کہتے ہیں وقت مرہم ہے

بہہ گیا جو ندامتوں میں سلیم
اشک وہ اشک آبِ زم زم ہے

◆

کیسی الجھن ہے سوچتا کیا ہے
صاف کہہ دے کہ مدعا کیا ہے

حسرتیں، یاس، زخم، محرومی
اور اس دل میں اب بچا کیا ہے

ہر گھڑی بے کلی و بے زاری
اے مرے دل تجھے ہوا کیا ہے

چاہتی کیا ہے کچھ تو واضح ہو
زندگی تیرا مدعا کیا ہے

دل کروں نذر یا کہ جان نثار
بول اے دوست چاہتا کیا ہے

قتل و خوں، رنجشیں، فریب، دغا
آہ! اب اس کے ما سوا کیا ہے

کیا بتائیں گے اگلی نسل کو ہم
پیار کیا چیز ہے وفا کیا ہے

وہ تباہی پہ میری ہنس کے سلیم
بس یہی کہہ سکے ہوا کیا ہے

❖

یہ گدا گر کہہ رہا ہے کیا بھلا
آدمی کا کر بھلا ہوگا بھلا

مسئلے تو زندگی کے ساتھ ہیں
مسئلوں سے کس لیے ڈرنا بھلا

دوستی کی آڑ میں ہے دشمنی
دوستوں سے دور ہی رہنا بھلا

زر پرستی کی ہوس نے کھو دیا
ورنہ ہر انسان تھا اچھا بھلا

بن ترے یہ زندگی کیا زندگی
ایسے جینے سے تو مر جانا بھلا

زندگی ہجر کہتی ہے سلیم
ایسے جینے سے تو مر جانا بھلا

❖

مفلسی، کیسے یہ ایام دکھائے مجھ کو
آج اپنے بھی نظر آئے پرائے مجھ کو

غم کا طوفان مچلتا ہے مرے سینے میں
آج خواہش ہے کوئی خوب رُلائے مجھ کو

اس کی خواہش ہے تو پھر ترک تعلق ہی سہی
میں نے کب اس سے کہا ہے کہ نبھائے مجھ کو

تنگ دستی میں سبھی ساتھ مرا چھوڑ چلے
ہمسفر میرے کبھی راس نہ آئے مجھ کو

ریت کا کوئی گھروندہ ہے یا کہرا کہ دھواں
زندگی کیا ہے کوئی اتنا بتائے مجھ کو

ایک مدت سے میسر نہیں آرام کی نیند
لوریاں دے کے بھلا کون سلائے مجھ کو

ایک پل کو کبھی تنہا نہیں رہنے دیتے
گھیر لیتے ہیں تری یاد کے سایے مجھ کو

کشتیِ زیست مری ڈوبنے والی ہے سلیم
اب کوئی جھوٹی تسلی نہ بندھائے مجھ کو

❖

ہم ہیں محنت کش ہمیں کیا واسطہ آرام سے
زندگی وابستہ ہے اپنی مسلسل کام سے

اس قدر بے گانگی، اتنا تغافل، یہ غرور
تو ابھی واقف نہیں ہے حسن کے انجام سے

اشرف المخلوق کی پستی کا عالم یہ کہ اب
آدمیت ہے ہراساں آدمی کے نام سے

پاس ہے امن و اماں کا اس لیے خاموش ہیں
ورنہ واقف ہم بھی ہیں جنگ وجدل کے نام سے

گردشِ دوراں کا یہ ہم پر کرم ہے اے سلیم
شہر میں پھرتے ہیں اپنے آج ہم بے نام سے

◆

پچھلی روایتوں کی ضرورت نہیں رہی
انسانیت کی اب کوئی قیمت نہیں رہی

کوہِ انا کی برف پگھلتی تو کس طرح
جذبوں میں پہلے جیسی حرارت نہیں رہی

ایثار، پیار، بوئے وفا، جذبۂ خلوص
اب آدمی کے پاس یہ دولت نہیں رہی

ہر شخص اپنے اپنے مسائل کی زد میں ہے
اب زندگی میں کوئی بھی راحت نہیں رہی

وہ بھی اب اپنی ذات میں محصور ہوگیا
ہم کو بھی اس سے اب کوئی رغبت نہیں رہی

اپنے بھی دل کی ہوگئیں سب حسرتیں تمام
جذبات میں اب ان کے بھی شدت نہیں رہی

پیسہ ہی آج زیست کی میزان ہے سلیم
علم و ہنر کی اب کوئی قیمت نہیں رہی

❖

خالق سے التماس کرے التجا کرے
کوئی تو ہو جو حق میں ہمارے دُعا کرے

وہ شمع حق جلے نہ بھلا کیسے حشر تک
''فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے''

فرقت کا غم اُٹھائے جا زندہ دلی کے ساتھ
توہینِ عشق ہوگی اگر تو گِلا کرے

دُشمن سے ایسے کون بھلا جیت پائے گا
جو دوستی کے بھیس میں چھپ کر دغا کرے

وہ جس کا میرے قتل کی سازش میں ہاتھ ہے
الزام اس پہ کوئی نہ آئے خدا کرے

یہ دور پر فریب ہے اس دور میں سلیم
ممکن نہیں ہے کوئی کسی سے وفا کرے

◆

اشک آنکھوں سے رواں ہونے لگے
زخم دل کے سب عیاں ہونے لگے

جس قدر ناکامیاں ملنے لگیں
حوصلے اتنے جواں ہونے لگے

کب چھپی رہتی ہے خوشبو پیار کی
راز چہرے سے عیاں ہونے لگے

ہائے یہ دور ترقی، راہزن
اب تو میرِ کارواں ہونے لگے

دل میں آیا تھا جدائی کا خیال
اشک آنکھوں سے رواں ہونے لگے

یا الٰہی خیر کرنا آج کل
وہ بھی ہم سے بدگماں ہونے لگے

دل کسی کو کیا دیا ہم نے سلیم
روز اپنے امتحاں ہونے لگے

❖

آپ نے ہم کو آزمانہ تھا
یہ جدائی تو اک بہانہ تھا

کیسا رنگین وہ زمانہ تھا
آپ کا میرا دوستانہ تھا

چھوڑیئے ہم بھی خوب واقف ہیں
کس طرف آپ کا نشانہ تھا

بجلیاں اس طرف ہی کیوں چمکیں
جس طرف میرا آشیانہ تھا

خود کو برباد کر لیا میں نے
اپنے یاروں کو آزمانہ تھا

جب محبت کی قدر ہوتی تھی
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

جس کو سن کر پگھل گئے پتھر
کتنا پر درد وہ فسانہ تھا

بعد از مرگ سب کہیں گے، سلیم
با وفا تھا، مگر دِوانہ تھا

◆

جھوٹی قسمیں کھانا مت
وعدوں سے بہلانا مت

یاروں کو ہمدرد سمجھ
دل کی بات بتانا مت

راہنماؤ! قوم کو پھر
جھوٹے خواب دکھانا مت

دل پر کتنی چوٹ لگے
لیکن اشک بہانا مت

ہر رشتہ ہے پیسے کا
اس سچ کو جھٹلانا مت

دل میں جو ہو کہہ دینا
کرنا کوئی بہانا مت

دل نے کس کی مانی ہے
دل کو تم سمجھانا مت

جس میں دولت والے ہوں
اس محفل میں جانا مت

دنیا ہے جادو نگری
دھوکے میں آجانا مت

اپنے دل کی بات سلیم
خود کو بھی بتلانا مت

❖

دیکھئے کب ہو اپنی سحر
سوچتے ہی رہے رات بھر

اب تو مولا تو ہی خیر کر
راہزن ہوگئے راہبر

پھول مُرجھاگئے عشق کے
لگ گئی جانے کس کی نظر

وہ بھی نظریں بدلنے لگے
یعنی قصہ ہوا مختصر

سوچ لیجے ذرا غور سے
راہ، الفت کی ہے پُر خطر

اپنے دل میں بھی آباد ہے
خواہشوں، حسرتوں کا نگر

غم تو ہر دل کا مہمان ہے
کس نے پایا ہے غم سے مفر

آپ کی آزمائش تھی یہ
ورنہ ہم بھی نہ تھے بے خبر

◆

رُخ سے پردہ اُٹھا دیجئے
مجھ کو پاگل بنا دیجئے

سب نشانے خطا ہوگئے
دشمنوں کو دُعا دیجئے

دل میں غنچے چٹک جائیں گے
آپ بس مسکرا دیجئے

کوئی تہمت نئی یا کہ غم
کچھ وفا کا صلہ دیجئے

آپ کیوں ہم سے ناراض ہیں
صرف اتنا بتا دیجئے

روشنی کے لیے پھر سلیم
شمع دل کی جلا دیجئے

❖

بھول بھی جایئے جو ہوا سو ہوا
منتخب کیجئے اب نیا راستا

ہر طرف نفرتیں، بغض و مکر و ریا
اس زمانے کو اللہ کیا ہوگیا

مال و زر کے خزینے مبارک تمہیں
ہم فقیروں کو دولت سے کیا واسطا

مفلسوں کے دلوں سے نہ یوں کھیلئے
دیکھئے لگ نہ جائے کہیں بددُعا

منزلیں بڑھ کے چومیں گی تیرے قدم
اپنے سوئے ہوئے حوصلے تو جگا

عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی زندگی
اصل میں آدمی کے لیے ہے سزا

❖

ریت کی ہے یہ دیوار گر جائے گی
زندگی اور کب تک ہے کس کو پتہ

اس نے خوشیاں چنیں میں نے غم چن لیے
اس کا میرا ہے اب مختلف راستہ

اس صدی کے مقدر میں ہے ہر گھڑی
اک نیا حادثہ اک نیا سانحہ

یہ تو چہرے ہیں سب آزمائے ہوئے
ان میں کوئی بھی چہرہ نہیں ہے نیا

رکھنا چاہو اگر دوستی کا بھرم
مانگنا مت کبھی دوستی کا صلہ

وقت ہے آج بھی دوستو سوچ لو
یہ چمن بن نہ جائے کہیں کربلا

ہونٹ سی لیجئے عمر بھر کو سلیم
چاہتے ہیں اگر آپ اپنا بھلا

◆

زردار سمجھتے نہیں لاچار کا معیار
لاچار سمجھ لیتے ہیں زردار کا معیار

ہم آج تک اقرار سمجھتے رہے جس کو
کتنا تھا حسیں آپ کے انکار کا معیار

یہ عصری تقاضوں کا کرم ہے کہ مسلسل
گرتا ہی چلا جاتا ہے فنکار کا معیار

سوچا بھی نہیں تم نے نگاہوں سے گرا کر
اس طرح بھی گرتا ہے کہیں پیار کا معیار

مفلس کا لہو پینے کی عادت ہے ازل سے
اتنا ہی تو ہے دوستو زردار کا معیار

بزدل کو کسی طور میسر نہیں ہوگا
ہے دستِ شجاعت میں جو تلوار کا معیار

سرمایۂ تعلیم سے بے بہرہ رہے جو
کیا سمجھیں سخنور کی وہ گفتار کا معیار

رکھا تھا سلیم اس لیے دنیا سے چھپا کر
اونچا تھا بہت مجھ سے مرے پیار کا معیار

⁂

سکون قلب گیا روح کا قرار گیا
وہ کیا گئے کہ زمانے کا اعتبار گیا

تمہارے نام پہ رو لینا آہ بھر لینا
ڈھلی جو عمر تو جذبوں کا سب خمار گیا

میں دفعتاً لرز اُٹھتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں
کہ عمر کیسے ترے ہجر میں گزار گیا

یہ ارتقائے زمانہ، کہ دور پستی ہے
کہ جس میں پیار، وفا، سب کا اعتبار گیا

یہ کس نے آئینۂ زیست کو جلا بخشی
یہ کون کاکلِ ہستی کو پھر سنوار گیا

شکست عشق میں ہوتی تو درگزر کرتا
میں بدنصیب مگر دوستی میں ہار گیا

کسی سے جب بھی کسی کی جفا کا ذکر سنا
مرا خیال تری سمت بار بار گیا

بساط عشق کی چالیں سلیم تھیں ہی عجیب
جو جیتتا نظر آیا وہ خود کو ہار گیا

❖

بن الفاظ کا کورا خط
اس نے مجھ کو لکھا خط

سوچ سمجھ کر لکھنا خط
دل کا ہے آئینہ خط

چھت پر کاگا بولا ہے
وہ آئے یا آئے گا خط

جب سے ٹیلیفون لگے
تب سے ہوگئے سپنا خط

خط لکھا اور پھاڑ دیا
اس تک کیسے جاتا خط

اکثر ہم نے دیکھا ہے
دے جاتا ہے دھوکا خط

مدت سے اک خواب ہوا
اس کے ہاتھ کا لکھا خط

بے چینی بڑھ جاتی ہے
جب آتا ہے اس کا خط

روح کو گھایل کرتا ہے
آدھا اور ادھورا خط

شاید منزل پا جائے
میری آشاؤں کا خط

دنیا کی نظروں سے سلیم
رکھنا بچا کر اس کا خط

◆

رنج و غم، کرب و بلا، جبر مسلسل کتنے
مسئلے زیست کے آخر میں کروں حل کتنے

ہر گھڑی تیرا تصور تری باتیں پیہم
ہوگئے ہم بھی ترے پیار میں پاگل کتنے

یہ الگ بات کہ برسے نہ مرے آنگن میں
یوں تو برسات میں چھائے رہے بادل کتنے

تری قسمیں ترے وعدے تیرے دلچسپ خطوط
دل میں طوفان مچاتے رہے پل پل کتنے

شہر کی دھوپ میں جب بھی مرا جلتا ہے بدن
یاد آتے ہیں ترے گاؤں کے پیپل کتنے

پیٹ تو بھرتا نہیں ضد ہے کھلونوں کی انھیں
اُف یہ بچے ہیں مرے شہر کے پاگل کتنے

❖

کچھ خاص دوستوں کی دُعا بے اثر گئی
جب میرے سر سے گردش دوراں گزر گئی

کچھ اس کے انتظار کا عالم نہ پوچھیے
''لگتا ہے جیسے وقت کی گردش ٹھہر گئی''

پگھلا گئی وہ موم کی مانند جسم کو
جذبوں کی تیز دھوپ جو پَل میں اُتر گئی

اس کی نگاہِ لطف و کرم اس کی دوستی
برباد کر گئی، مجھے برباد کر گئی

یہ انقلاب ہے یا زمانے کا ارتقا
قتل و فساد دیکھے جہاں تک نظر گئی

◆

کیا کہوں آج کہ کس طرح تری یاد آئی
دفعتاً کھل اُٹھا آنگن میں گلِ تنہائی

ہر طرف جشنِ بہاراں ہے چمن میں لیکن
دل کے آنگن میں فقط آہ و کسک تنہائی

اُف نہ کی ہم نے یہی سوچ کے خاموش رہے
ہو نہ جائے کہیں محفل میں تری رسوائی

دل میں پھر برق سی کوندی ہے تری یادوں کی
پھر مری آنکھوں میں ساون کی گھٹا گھر آئی

پڑھ لی کتنے ہی دِوانوں نے نماز الفت
جب بھی محراب نظر آئی تری انگڑائی

بعد مدّت کے کھلے دل میں اُمیدوں کے کنول
جاگے ارمان مرے فکر نے لی انگڑائی

◆

وہ حسن جو ہے میرے خیالوں میں آج بھی
شاید نہ مل سکے وہ مثالوں میں آج بھی

حالانکہ اس کو مجھ سے ملے مدتیں ہوئیں
کھویا ہوا ہوں اس کے خیالوں میں آج بھی

ترک تعلقات کو صدیاں گزر چکیں
شہرت ہے میری زہرہ جمالوں میں آج بھی

یہ زندگی ہے میری ریاضی کا آئینہ
الجھا ہوا ہوں جس کے سوالوں میں آج بھی

بہرِ سکونِ قلب و نظر بہرِ زندگی
انساں بھٹک رہا ہے شوالوں میں آج بھی

جس کو سلیمؔ خواب میں دیکھا تمام شب
پایا نہ اس کو دن کے اُجالوں میں آج بھی

◆

دل پہ جو بوجھ غم کا ہے اس کو اُتار لو
جیسے گزر رہی ہے شب غم گزار لو

مٹ جائیں گی دلوں سے ہمیشہ کو نفرتیں
اپنی وفائیں دے کے مرا اعتبار لو

غم کے سوا بچے نہ مری زندگی میں کچھ
میرا سکون چھین لو، صبر و قرار لو

لمحہ نہیں ہوں سال نہیں ہوں صدی نہیں
آجاؤں گا پلٹ کے اگر تم پکار لو

گلشن کے خار و گل میں کہیں ٹھن نہ جائے پھر
موقع ہے اب بھی نظمِ گلستاں سنوار لو

اس کی خوشی اگر ہے یہی پھر تو اے سلیم
گل اس کو نذر کردو سبھی، آپ خار لو

◆

یوں بھی غم کی ہنسی اُڑاؤ کبھی
شدتِ غم میں مسکراؤ کبھی

بے بسوں کو نہ آزماؤ کبھی
دل کسی کا نہ تم دکھاؤ کبھی

ایک مدت سے ہم ہیں افسردہ
زندگی سے ہمیں ملاؤ کبھی

فاصلے دل کو اب نہیں بھاتے
ایسے آؤ کہ پھر نہ جاؤ کبھی

یادِ ماضی ہے اک رواں دریا
رُک سکا کس سے یہ بہاؤ کبھی

سنتے ہیں وقت مثل مرہم ہے
بھر ہی جائے گا دل کا گھاؤ کبھی

عیب جوئی جہاں کی آساں ہے
عیب اپنے بھی خود گناؤ کبھی

حادثے حوصلے بڑھاتے ہیں
حادثوں سے نہ خوف کھاؤ کبھی

قول اور فعل ایک ہے اپنا
شک اگر ہو تو آزماؤ کبھی

غم کا دریا رواں ہے نس نس میں
کوئی یہ روک دے بہاؤ کبھی

ساری دنیا بدل گئی لیکن
اک نہ بدلا مرا سبھاؤ کبھی

اب جو ویراں کھنڈر سا لگتا ہے
تھا شہنشاہ کا پڑاؤ کبھی

نام بتلاؤ مت صحیح اپنا
جیوتشی کو بھی آزماؤ کبھی

ضبط رکھیے گا آنسوؤں پہ سلیم
آفتوں میں جو مسکراؤ کبھی

◆

جہاں میں کوئی بھی اس کا نہیں ہے
وہ جس کی جیب میں پیسا نہیں ہے

زمانہ بے وفا کہتا ہے اُس کو
مرے نزدیک وہ ایسا نہیں ہے

کھلا یہ راز وقت آزمائش
کہ اپنا بھائی بھی اپنا نہیں ہے

وہ پیسے کا پجاری اور معزز؟
یہ پھر کیا ہے اگر دھوکا نہیں ہے

ابھی اک اور عدالت بھی ہے باقی
یہ شاید آپ نے سوچا نہیں ہے

کسی کی آہ تجھ کو لگ نہ جائے
دلوں سے کھیلنا اچھا نہیں ہے

وہ اپنے آپ میں ہے رشکِ محفل
جو تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہے

جو ساری نفرتوں کا زہر پی لے
جہاں میں کیا کوئی ایسا نہیں ہے

جو اپنی خامیوں کو دور کر لے
سلیم اس سے کوئی اچھا نہیں ہے

❖

جینے کا سامان نہیں
دل میں کوئی ارمان نہیں

میرے دل کے حال سے وہ
غافل ہے انجان نہیں

ترک تعلق اور ہم سے
مشکل ہے آسان نہیں

پیاسے کو قطرے کی بھیک
یہ تو کوئی احسان نہیں

غم کے بادل چھٹ جائیں
ایسے تو امکان نہیں

زہر بھی پینا پڑتا ہے
حق گوئی آسان نہیں

تم ہی کچھ بتلاؤ سلیم
زیست کا ہم کو گیان نہیں

❖

آخرش مشورے میں یہ ٹھہرا
ہر زباں، ہر قلم پہ ہو پہرا

ہٹ گیا دل سے ذہن کا پہرا
پیار کا رنگ جب ہوا گہرا

بعد مدت کے وہ کچھ ایسے ملے
زخم پھر دل کا ہوگیا گہرا

حسرت و یاس زخم، محرومی
سب کا مسکن مرا ہی گھر ٹھہرا

کس سے فریاد اب کرے کوئی
حاکم وقت ہوگیا بہرا

جو بظاہر کھلی کتاب سا ہے
درحقیقت وہی تو ہے گہرا

جعل سازی فریب مکاری
آج کے دور میں ہنر ٹھہرا

بات جب آئی حق بیانی پر
لگ گیا ہر زبان پر پہرا

میرے کردار کا محافظ ہے
مجھ پہ میرے ضمیر کا پہرا

دل تو آوارہ ہے ازل سے سلیم
ایک محور پہ یہ کہاں ٹھہرا

❖

اب کہاں خیر سگالی باتیں
کون کرتا ہے مثالی باتیں

سب سے ملتا ہے محبت سے مگر
ہم سے کرتا ہے سوالی باتیں

وہ سمجھتا ہے وہی کرتا ہے
ساری دنیا سے نرالی باتیں

جو حقیقت ہے وہی کہتا ہوں
میں نہیں کرتا خیالی باتیں

بات اس سے میں کروں تو کیسے
وہ سمجھتا ہو جو گالی باتیں

انتخابات کا موسم آیا
خوب اب ہوں گی خیالی باتیں

اپنے بیگانوں سے اب روز سلیم
سنتے رہتے ہیں جلالی باتیں

❖

دشمن بھی کبھی، دوست سے اچھا نہیں لگتا؟
سچ بولیے کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا

کہنے کو تو اپنوں کی یہاں بھیڑ ہے لیکن
اس بھیڑ میں اک شخص بھی اپنا نہیں لگتا

نس نس میں بسا لی ہے ترے پیار کی خوشبو
تو مجھ سے بہت دور ہے ایسا نہیں لگتا

تا عمر یہاں ساتھ نبھانا نہیں آساں
وعدہ یہ کسی طور بھی سچا نہیں لگتا

چرچا جو ہوا ترک تعلق کا جہاں میں
کیا اس میں قصور آپ کو اپنا نہیں لگتا

اک پل میں وہ تولہ ہے تو اک پل میں ہے ماشہ
وہ شخص کسی طور بھی دانا نہیں لگتا

دعویٰ تو وہ کرتا ہے مسیحائی کا لیکن
کردار و عمل سے وہ مسیحا نہیں لگتا

چالوں میں ترپ چال بھی اک چال ہے یارو
نہلے پہ ہر اک بار ہی دہلا نہیں لگتا

کیا کرتے سلیم اس سے جفاؤں کا گلہ ہم
جو قول و عمل سے کبھی سچا نہیں لگتا

◆

اب کیا بتاؤں دوست نے کیا کچھ کہا مجھے
بس یوں سمجھئے سونگھ گیا سانپ سا مجھے

دروازہ دیکھتا رہا آہٹ پہ بار بار
ہر بار اس کے آنے کا دھوکہ ہوا مجھے

سچ تو یہ ہے وہ دید کا منظر عجیب تھا
وہ دیکھتا تھا آئینہ اور آئینہ مجھے

میں جانتا ہوں وعدۂ فردا فریب ہے
پھر بھی تو انتظار کا ہے حوصلہ مجھے

دولت، غرور، حرص و ہوس اور رنجشیں
ان آفتوں سے دور ہی رکھنا خدا مجھے

مہر و خلوص دل کے لیے بن گیا عذاب
رلوا رہی ہے خون کے آنسو وفا مجھے

مدت کے بعد آئینہ دیکھا تو ڈر گیا
میں خود سے پوچھنے لگا یہ کیا ہوا مجھے

اس نے سلیم کہہ کے پکارا جو بزم میں
احساس اپنے ہونے کا کچھ تو ہوا مجھے

❖

میل، مروت، رشتہ داری آج فقط افسانے ہیں
وقت پڑا تو ہم نے جانا اپنے بھی بے گانے ہیں

راہِ حق میں میری مولا تو ہی راہنمائی کر
منزل بھی معلوم نہیں اور رستے بھی انجانے ہیں

ان کو انسانوں کی صف میں رکھنا میرا شغل نہیں
ایسے لوگ جو جھوٹی شان و شوکت کے دیوانے ہیں

میں رہتا ہوں مجبوری میں کچھ ایسے لوگوں کے بیچ
خود غرضی ایمان ہے جن کا، دولت کے دیوانے ہیں

فاقہ مستی جن کا مذہب، خودداری ہے جن کی خو
ان کو دیوانہ مت کہنا، وہ تو میاں فرزانے ہیں

نسلِ نو میں ڈھونڈ رہے ہو چاہت کے جذبات کہاں
بس ان میں اخلاص ہے باقی جو کچھ لوگ پرانے ہیں

❖

ظلم کو حق، جو ستم کوشی کو عادت جانیں
وہ بھلا کیا کسی مفلس کی ضرورت جانیں

اب تو رسماً بھی ملاقات سے بیگانہ ہیں
آج کے لوگ کہاں میل مروت جانیں

اپنی اولاد سے رکھتے ہیں توقع کیوں کر
اپنے ماں باپ کو جو لوگ مصیبت جانیں

کوئی رسماً ہی سہی حال اگر پوچھے تو
آج کے دور میں اتنا بھی غنیمت جانیں

یہ رہِ عشق ہے اس راہ پہ چلنا ہے تو پھر
زخم کو پھول کہیں درد کو راحت جانیں

جن کو ہو ہی نہ سکی عشق کی معراج نصیب
وہ بھلا کیسے محبت کی فضیلت جانیں

جاں نثاری کے یہ دعوے یہ ترا حسنِ سلوک
صرف دھوکا ہی تو ہے ہم تری عادت جانیں

ہم تو وہ ہیں جو محبت میں فنا ہوتے ہیں
ہم سے دیوانے کہاں ترکِ محبت جانیں

کس نے برباد کیا ہے یہ چمن مت پوچھو
کارواں لٹتے رہے کس کی بدولت جانیں

مال و زر، لعل و جواہر کی ہمیں چاہ نہیں
ہم ہیں بے گانۂ دولت، اسے لعنت جانیں

وقت نے دے دئے ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم
جو ادب اور صحافت کو تجارت جانیں

صرف قسمت پہ بھروسہ ہی نہیں ٹھیک سلیم
وقت کی قدر کریں، وقت کی قیمت جانیں

◆

تڑپتے ہیں غم فرقت میں تڑپایا نہیں کرتے
محبت کرنے والے غم سے گھبرایا نہیں کرتے

چلے آؤ محبت میں تکلف کیا ضروری ہے
تم اپنے ہو تو پھر اپنوں سے شرمایا نہیں کرتے

محبت ہی متاعِ جان و دل ہے اے مرے ہمدم
جو جانِ زندگی ہو اس سے کترایا نہیں کرتے

یہ قسمیں اور وعدے پیار و الفت کے نبھائیں گے
یقیناً ہم کبھی جھوٹی قسم کھایا نہیں کرتے

سلیم اپنا تو شیوہ ہے محبت کرنے والوں کو
گلے بڑھ کر لگا لیتے ہیں ٹھکرایا نہیں کرتے

◆

ایمان خود فریبی پہ لائے ہوئے ہیں لوگ
لیکن حقیقتوں کو چھپائے ہوئے ہیں لوگ

نسبت جنہیں ذرا بھی وفا نام سے نہیں
ان سے وفا کی آس لگائے ہوئے ہیں لوگ

اب کچھ نہیں ہے یاد ترے نام کے سوا
گویا متاعِ ہوش گنوائے ہوئے ہیں لوگ

چونسٹھ برس کے بعد بھی آزاد ہند میں
بے چارے مفلسی کے ستائے ہوئے ہیں لوگ

حیرت زدہ ہوں ایسے پر آشوب دور میں
بارِ غمِ حیات اُٹھائے ہوئے ہیں لوگ

تنقید دوسروں پہ تو کرتے ہیں اے سلیم
لیکن خود اپنے عیب چھپائے ہوئے ہیں لوگ

◆

کس طرح تمہیں پاؤں اتنا تو بتا دو تم
پھر اپنی محبت کا احساس دلا دو تم

پردے سے نکل آؤ جلوہ تو دکھا دو تم
دیوانہ ہوں دیوانہ کچھ اور بنا دو تم

مجرم ہوں محبت کا ثابت یہ کرو پہلے
پھر شوق سے جو چاہو وہ مجھ کو سزا دو تم

تم لاکھ کرو دعوے لیکن میں سمجھتا ہوں
ممکن ہی نہیں دل سے جو مجھ کو بھلا دو تم

ایسا نہ ہو گر جاؤ خود اپنی نگاہوں سے
دل سے مری نفرت کا احساس مٹا دو تم

اب مجھ کو محبت کا انعام عطا کردو
یہ فاصلے راہوں کے خود بڑھ کے مٹا دو تم

کچھ جرم ہے میرا بھی کچھ تم بھی تو مجرم ہو
گر جرم یہ الفت ہے خود کو بھی سزا دو تم

الفت بھری نظروں سے دیکھا ہے سلیم اس نے
جاگے ہیں نصیب ایسے قسمت کو دُعا دو تم

❖

وادیٔ دل مِری ویران ہوئی تیرے بغیر
زندگی بے سر و سامان ہوئی تیرے بغیر

لاکھ چاہا کہ چھپا لوں میں سبھی رنج و الم
بے کسی چہرے کا عنوان ہوئی تیرے بغیر

میری دنیا جو تھی آباد کبھی خوشیوں سے
دیکھتے دیکھتے ویران ہوئی تیرے بغیر

تجھ سے ملنے کی تمنا ہے تو میں زندہ ہوں
ورنہ یہ زندگی ویران ہوئی تیرے بغیر

تجھ سے بچھڑا تو ملی راہ میں سوغات الم
مجھ سے ہر اک خوشی انجان ہوئی تیرے بغیر

تو نہیں ہے تو نہیں ہے کوئی اُمیدِ حیات
زندگی موت کا سامان ہوئی تیرے بغیر

ٹھوکریں کھاتا رہا راہوں میں تا عمر سلیم
منزلِ عشق نہ آسان ہوئی تیرے بغیر

◆

آنکھوں میں کوئی خواب لبوں پر ہنسی نہیں
یہ زندگی ہے جیسے کوئی زندگی نہیں

ہونٹوں پہ آہ، دل میں کسک، روح بے قرار
جینے کو جی رہا ہوں مگر زندگی نہیں

گل ہیں اُداس اُداس تو کلیاں ہیں بے قرار
اس موسم بہار میں کچھ دلکشی نہیں

ہر ذہن میں فریب ہے، ہر شخص بے وفا
پاسِ وفا نہیں ہے کوئی دوستی نہیں

اک دوسرے کے غم سے جو انجان ہیں بشر
ان کو شعورِ فکر و نظر آگہی نہیں

ہر چہرے پر نقاب ریا کاریوں کا ہے
ڈھونڈے سے بھی جہاں میں کوئی سادگی نہیں

افسردہ دل ہیں غنچے فضائے چمن اُداس
کیا بات ہے گلوں میں بھی اب تازگی نہیں

دل ہی جلے تو راہوں میں کچھ روشنی تو ہو
مٹی کے ان چراغوں میں اب روشنی نہیں

ترکِ تعلقات پہ سوچا ہے بار بار
ملتے نہیں ہیں اور کوئی بات بھی نہیں

وہ پہلی بار ملے ہیں مگر سلیم
محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اجنبی نہیں

◆

اگر یہ دردِ غم زندگی نہیں ہوتا
تو زندہ رہنے کا کچھ لطف بھی نہیں ہوتا

وہ شخص واقف رمزِ خوشی نہیں ہوتا
جو آشنائے غمِ زندگی نہیں ہوتا

کسک تو ہوتی ہے دل میں پتہ چلے نہ چلے
ہر ایک درد مگر دائمی نہیں ہوتا

وہ غم جو بخشتا ہے دل کو کرب کی لذت
مداوا اس کا کوئی واقعی نہیں ہوتا

تمہاری چشم عنایت جو ہو گئی ہوتی
تو پھر یہاں کوئی دامن تہی نہیں ہوتا

تمہارا بخشا ہوا درد بھی ہے کیسا درد
کبھی یہ ہوتا ہے دل میں کبھی نہیں ہوتا

سلیم ان کا عطا کردہ درد فرقت بھی
فزوں تو ہوتا ہے ہاں کم کبھی نہیں ہوتا

◆

مجھے حیرت ہے میری زیست میں یہ تلخیاں کیوں ہیں
خلوصِ دل سے جو سجدے کیے وہ رائیگاں کیوں ہیں

تھا جن کا ہاتھ میرے قتل کر دینے کی سازش میں
وہ میرے ہمنوا کیسے بنے اب مہرباں کیوں ہیں

تمھیں کہتے تھے میں ترکِ تعلق پر بہت خوش ہوں
یہ آہیں بھرنا کیا معنی، یہ آنسو پھر رواں کیوں ہیں

کبھی بجتے تھے جن کے نام کے ڈنکے زمانے میں
وہ جابر اور قاہر آج بے نام و نشاں کیوں ہیں

یہ کیسا خوف ہے چھایا ہوا ہر ایک چہرے پر
ہنسی رہتی تھی جن کے لب پہ وہ محوِ فغاں کیوں ہیں

تباہی کے بھیانک سلسلے کب تک مرے مالک
سرشتِ آدمِ خاکی میں یہ خونخواریاں کیوں ہیں

سلیم اپنے لہو سے جن کو ہم نے تازگی دی تھی
خدا جانے وہ غنچے آج معتوب خزاں کیوں ہیں

❖

آسودگی نصیب، نہ کوئی خوشی مجھے
لائی ہے کس مقام پہ یہ زندگی مجھے

ٹھکرا رہا ہوں زیست کی ہر اک خوشی کو میں
وہ لطف دے رہا ہے غم بے کسی مجھے

لے آئی بے خودی مجھے ایسے مقام پر
بھولا ہوں زندگی کو میں اور زندگی مجھے

جو زخم بھر گئے تھے وہ رسنے لگے ہیں پھر
ماضی کی یاد آکے جو تڑپا گئی مجھے

ساقی کے التفاتِ مسلسل کے باوجود
محسوس ہو رہی ہے ابھی تشنگی مجھے

فرزانے لے کے آئے جو ہاتھوں میں سنگ و خشت
خوش ہوں کہ راس آگئی دیوانگی مجھے

رُک رُک کے دیکھتا ہوں رہِ عشق میں سلیم
شاید کسی نے دور سے آواز دی مجھے

❖

ہو گیا آج فیصلہ دل کا
کہہ دیا ان سے مدعا دل کا

ریزہ ریزہ بکھر گیا آخر
عشق میں حال یہ ہوا دل کا

سب خطائیں فقط نگاہ کی تھیں
نام بدنام ہو گیا دل کا

لاکھ کوشش کرو نہیں جڑتا
ٹوٹ جائے جو آئینہ دل کا

جب سے اُس نے نگاہ پھیری ہے
قصر ویران ہو گیا دل کا

جسم ہو جائیں گے فنا لیکن
ختم ہوگا نہ رابطہ دل کا

زندگی کی ادھیڑ بن میں سلیم
ہو گیا تنگ قافیہ دل کا

❖

دوستی، دشمنی، رہبری دو رُخی
اس صدی میں ہر اک شہ ملی دو رُخی

کوئی کچھ بھی کہے پر حقیقت ہے یہ
جی رہے ہیں سبھی زندگی دو رُخی

وہ نظر میں مری معتبر یوں نہیں
اس نے جب بات کی بات کی دو رُخی

دل میں کچھ، ذہن میں کچھ زباں پر ہے کچھ
اور کاغذ پہ تحریر بھی دو رُخی

دین کے ہی رہے اور نہ دنیا کے ہم
جب سے کرنے لگے پیروی دو رُخی

کس طرح دوست دشمن کی پہچان ہو
ان کا کردار و گفتار بھی دو رُخی

کیسے ممکن ہے امن و ترقی وہاں
ہو رہی ہو جہاں رہبری دو رُخی

نعرۂ امن بھی تھا تشدد بھی تھا
مار کرتی رہی یہ صدی دو رُخی

کانپ اُٹھا ملامت سے اپنا قلم
جب کبھی ہم نے کی شاعری دو رُخی

مار ڈالے گی اک دن یقیناً سلیم
اک مسیحا کی چارہ گری دو رُخی

◆

اک جملے میں چار زبانیں بولے ہیں
اپنے دور کے کیا کمپیوٹر بچے ہیں

خط میں آپ نے پوچھا ہے ہم کیسے ہیں
شہرِ دل ویران ہے لیکن اچھے ہیں

رحم نہیں کھاتے ہیں وہ ناداروں پر
پیسے والوں کے دل کتنے چھوٹے ہیں

وقت پڑا تو یہ بھی کام آجائیں گے
کر لیجے محفوظ جو کھوٹے سکے ہیں

بیٹے بوجھ سمجھتے ہیں اب ماؤں کو
کیسے کہہ دوں خون کے رشتے سچے ہیں

خط آیا پردیس سے شاید بیٹے کا
رُک رُک کر اک ماں کے آنسو بہتے ہیں

ساتھ چلے تو راز یہ ہم پر فاش ہوا
اونچے قد والے بھی کتنے بونے ہیں

ہو جاؤ گے زخموں سے تم چور سلیم
سچ کے رستے مشکل ہیں، پتھریلے ہیں

◆

دل میں طوفان جو ماضی کے ابل جاتے ہیں
روکنا چاہوں مگر اشک نکل جاتے ہیں

میری آہوں نے انھیں کر دیا پتھر جب کہ
لوگ کہتے ہیں کہ پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

ان سے کہہ لیتے ہیں احوال، خیالوں میں سہی
یوں بھی ارمان کئی بار نکل جاتے ہیں

آج جسموں کی تجارت ہے مہذب پیشہ
اس سے لوگوں کے کئی کام نکل جاتے ہیں

جو ہیں فرزانے وہی ٹھوکریں کھاتے ہیں بہت
اور دیوانے کئی بار سنبھل جاتے ہیں

آج بھی ان سے مرا سامنا ہوتا ہے اگر
دل میں سوئے ہوئے ارمان مچل جاتے ہیں

اس نے یہ سوچ کے ہی مجھ کو سنبھالے رکھا
کھوٹے سکے بھی کبھی وقت پہ چل جاتے ہیں

نام لیتا ہے کبھی وہ جو سر بزم مرا
دیکھتا ہوں کہ کئی چہرے بدل جاتے ہیں

دشمنوں سے نہ گلہ ہے نہ شکایت ہے سلیم
مجھ کو خوش دیکھ کے کچھ دوست ہی جل جاتے ہیں

❖

نغمۂ مہرو اخوت بھی سنا ہی دیں گے
بڑھ کے اس فرقہ پرستی کو مٹا ہی دیں گے

فتنے اُٹھ جانے سے پہلے ہی کرو سدِ باب
فتنے اُٹھیں گے تو پیغام تباہی دیں گے

پیار محکم ہے کوئی ریت کی دیوار نہیں
وقت آنے پہ زمانے کو دکھا ہی دیں گے

جب کبھی ہم کو ہوئی عشق کی مَعراج نصیب
یہ سرِ شوق ترے در پہ جھکا ہی دیں گے

لاکھ بیٹھاؤ کمیشن مگر تفتیش کے بعد
رہبر وقت حقیقت کو چھپا ہی دیں گے

خونِ ناحق کبھی بے کار نہیں جاسکتا
تیرے دامن پہ جو دھبّے ہیں گواہی دیں گے

جب سنیں گے وہ تباہی کا مری حال سلیم
دستِ نازک وہ دُعاؤں کو اٹھا ہی دیں گے

◆

کبھی رنج و غم کبھی نفرتیں مجھے تجھ سے کیا کیا ملا نہیں
مرے ہم نفس مری زندگی مجھے پھر بھی کوئی گلا نہیں

کوئی جشن کوئی خوشی نہ تھی سبھی مسکراہٹیں قید تھیں
وہ بہار کیسی بہار تھی کوئی پھول جس میں کھلا نہیں

مرے درد کو جو سمجھ سکے، مری چاہتوں کو پرکھ سکے
کبھی آج تک مجھے دہر میں کوئی دوست ایسا ملا نہیں

نہ تو رنج و غم سے ہی ربط ہے نہ ہی آشنائے خوشی ہوں میں
مری زندگی بھی عجیب ہے اسے منزلوں کا پتا نہیں

ہو یقین یاروں پہ کس طرح سبھی آستینوں کے سانپ ہیں
اے سلیم دورِ جدید میں کہیں نام کو بھی وفا نہیں

❖

زینتِ دار و رسن مجھ کو بنایا جائے گا
ظلم سے پھر شورِ طوفاں کو دبایا جائے گا

بات کرنے کو ترس جائیں گے اہلِ انجمن
ہر زباں پر اس طرح پہرہ لگایا جائے گا

تیز ہو جائیں گی ظلم و جور کی پھر آندھیاں
پھر کسی مجبور کے گھر کو جلایا جائے گا

کب تلک ڈستا رہے گا ناگ روپی یہ جہیز
دلہنوں کو کب تلک زندہ جلایا جائے گا

جن چراغوں سے ملے گی پیار، الفت کی ضیا
ان چراغوں کو سرِ محفل بجھایا جائے گا

جن کتابوں سے ملے گا درسِ ایثار و وفا
دیکھ لینا ایک دن ان کو جلایا جائے گا

پی رہے ہیں جو لہو میرے وطن کا اے سلیم
ان کے سینوں کو ہی تمغوں سے سجایا جائے گا

◆

اللہ اللہ مجھ پہ ان کا در کھلا
یا سجودِ شوق کا محور کھلا

کیا خبر کب اس کی یادیں لوٹ آئیں
اس لیے رکھتا ہوں دل کا در کھلا

کتنے چہروں سے نقابیں ہٹ گئیں
جو پس منظر تھا وہ منظر کھلا

بھائی کے ہاتھوں ہوا بھائی کا قتل
تھا سیاست کا یہ سب چکر کھلا

خیر ہو پھر حق کے پروانوں کی خیر
ہاتھ میں پھر اس کے ہے خنجر کھلا

کیا کوئی دستار قسمت میں نہیں
ایک مدت سے ہے میرا سر کھلا

سامنے تھی موت وہ بے خوف تھا
دیکھا دنیا بھر نے یہ منظر کھلا

◆

آئی کسی کی یاد تو رنجور ہوگیا
میں اپنے آپ سے بھی بہت دور ہوگیا

محفل میں چھڑ گیا جو وفاؤں کا تذکرہ
چہرہ کسی کا دیکھئے بے نور ہو گیا

کس کس سے بے وفائی کا اب کیجئے گلہ
اب یہ سلوک دہر کا دستور ہوگیا

محرومیوں نے میری کیا ہے مجھے اسیر
دنیا سمجھ رہی ہے کہ مغرور ہو گیا

میرے اصول مجھ کو کبھی کچھ نہ دے سکے
اس کے سوا کہ بکنے کو مجبور ہوگیا

اپنی انا کو مار لیا آپ کے لیے
میں یہ ستم بھی سہنے کو مجبور ہو گیا

آلامِ روزگار نے فرصت نہ دی سلیم
یوں اپنی ذات سے بھی بہت دور ہو گیا

◆

باری باری سب کا نمبر آئے گا
جو بھی سچ بولے گا مارا جائے گا

میرا دعویٰ ہے وہ خلعت پائے گا
خودداری جو گھر پر رکھ کر آئے گا

سچ کہتے ہیں ماضی ہو یا پہلا پیار
جتنا بھولنا چاہو گے یاد آئے گا

نالائق بیٹے سے ماں کو ہے اُمید
صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے گا

دادی کو فرصت ہی کب ہے ٹی وی سے
پریوں کے اب قصے کون سنائے گا

فکر دنیا وہ بھی اتنی ٹھیک نہیں
وقت سے پہلے ہی پاگل مر جائے گا

اخلاق و کردار کی کوئی شرط نہیں
جو جیتے گا وہ رہبر بن جائے گا

کوئی تو ہو جو سکھ دکھ کا ساتھی ہو سلیم
زیست کا رستہ تنہا کب کٹ پائے گا

❖

ہمارے دور کا یہ سانحہ ہے
کہ اب انساں کو انساں ڈس رہا ہے

میں خود حیران ہوں یہ کیا ہوا ہے
مجھے اور آپ نے اپنا کہا ہے

ہمیشہ خود سے شرمندہ رہا ہوں
کسی جھوٹے کو جب سچا لکھا ہے

نہیں ہٹلر نہیں فرعون ہے وہ
خدا بننے کی کوشش کر رہا ہے

مری حق گوئی کی سوغات، ہے یہ
کہ ہر الزام میرے سر گیا ہے

ستم سہنا پڑا ہے مسکرا کر
وفا کا پاس یوں رکھنا پڑا ہے

میں خود پہ ظلم سہہ کر چپ ہوں یعنی
ضمیر اب میرا بھی مرنے لگا ہے

◆

اپنی قسمت میں لکھا تھا اس کی زلف کا سایا کب
جس کو ہم نے ٹوٹ کے چاہا اس نے ہم کو چاہا کب

ایک سے ایک ملیں تو اکثر وہ گیارہ ہو جاتے ہیں
اتنی چھوٹی بات کو آخر سمجھے گا ہمسایہ کب

دُکھ سے اپنا یارانہ تھا سارا جیون ساتھ رہا
سکھ کا بادل میرے گھر آنگن کے اوپر برسا کب

دل کے اندر غم کا ساون برسوں ٹوٹ کے برسا ہے
تیری رسوائی کے ڈر سے لیکن کھل کر رویا کب

اک دن ایسا بھی آئے گا سچائی کی ہوگی جیت
سب کہتے ہیں ایسا ہوگا لیکن ایسا ہوگا کب

سچائی سے کرنا سیکھو آنکھیں اپنی چار سلیم
خوابوں سے اُمیدیں کیسی خواب ہوا ہے سچا کب

◆

بے چین سا ہے دل، تو کبھی ہے قرار میں
یہ کیفیت ہوئی ہے ترے انتظار میں

گل بھی نہیں ہیں گل نگہہِ اعتبار میں
دل ہے شگفتگی سے گریزاں بہار میں

اب عشق میں نہ قیس نہ فرہاد ہے کوئی
تارے شمار کون کرے ہجرِ یار میں

تنہائی، یادیں، یاس، کسک اور حسرتیں
سوغات ہم کو خوب ملیں تیرے پیار میں

وعدہ وفا ہوا ہے نہ ہوگا یقین ہے
کٹ جائے گی یہ زیست یونہی انتظار میں

اب قرض لینا بن گیا فیشن سماج کا
سب زندگی گزار رہے ہیں ادھار میں

یادوں کے پربتوں پہ جمی برف بہہ گئی
ماضی کے زخم کھل اُٹھے پھر سے بہار میں

تقدیر، وقت، موت، جنم ہو کہ زندگی
سچ تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں اختیار میں

قسمت اسے کہیں نہ اگر پھر تو کیا کہیں
رہنے کو اک مکان نہیں کوئے یار میں

دنیا سرائے اور مسافر ہیں ہم سلیم
‘‘کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں’’

❖

روایت اب نہیں باقی وفا کی، دوستانے کی
میاں اب چھوڑ دو عادت یہ سب کو آزمانے کی

اگر چاہیں تو اس لہجہ میں ہم بھی بول سکتے ہیں
مگر عادت نہیں ہم کو کسی کا دل دکھانے کی

کہے جانے، عمل کرنے میں کتنا فرق ہوتا ہے
ہوئی ناکام ہر کوشش تمھیں اب تک بھلانے کی

وہ مجھ سے آج کیوں ترک تعلق پر ہے آمادہ
قسم کھائی تھی جس نے عمر بھر رشتہ نبھانے کی

نہ غم ہوتا، نہ دل روتا، نہ ہم اپنا سکوں کھوتے
سمجھ لیتے اگر بر وقت فطرت اس زمانے کی

غم جاناں سے اے جاناں فراغت کب ملی ہم کو
‘غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی’

نہیں آنا، نہیں آؤ، یہ ہم سے منتیں کیسی
تمھیں آخر ضرورت کیا کسی حیلے بہانے کی

ابھی ترک تعلق کا کوئی خدشہ نہیں یارو
ابھی گنجائشیں باقی ہیں روٹھوں کو منانے کی

سلیم اب کیا کریں شکوہ، یہی اپنا مقدر ہے
انھیں عادت پرانی ہے ہمارا دل دکھانے کی

◆

سچ بولنے پہ بارہا ایسا بھی ہوا ہے
دستار کی تو چھوڑیے سر بھی نہ بچا ہے

اب امن وسکوں ہے نہ کوئی جشن نیا ہے
اس دور کی تقدیر میں بس کرب و بلا ہے

اک دور تھا جب کثرت اولاد تھی نعمت
اس دور میں تو کثرت اولاد سزا ہے

اب کون رہا اگلی روایات پہ قائم
اس دور میں ہے کون جو پابند وفا ہے

اب گردش حالات بگاڑے گی مرا کیا
ہے کیا جو بگڑنے کو مرے پاس بچا ہے

کیا کیا نہیں دیوانہ بنانے کو ترے پاس
شوخی ہے، شرارت ہے، تبسم ہے، ادا ہے

اب سانپ بھی خائف سے رہا کرتے ہیں اس سے
انسان نے انسان کو اس درجہ ڈسا ہے

وہ عشق کا بیمار ہے، اللہ بچائے
سچ ہے کہ علاج اس کا دوا ہے نہ دُعا ہے

اوروں کی پریشانی میں خود رہنا پریشاں
یہ وصف سلیم اپنے بزرگوں سے ملا ہے

❖

کم سے کم اتنی مروت تو ہے تکرار کے ساتھ
قتل کرتا ہے مرا دوست مگر پیار کے ساتھ

یوں نہ ہو اپنی بھی پہچان کہیں کھو بیٹھو
دوستی کر تو رہے ہو میاں زردار کے ساتھ

تیری حق گوئی نہ بن جائے کہیں جاں کا عذاب
سوچ لے سر بھی نہ جائے کہیں دستار کے ساتھ

تکتے رہنا ترے بیمار کا تجھ کو ہر دم
اور تیرا یہ تغافل دل بیمار کے ساتھ

رنجشیں اور بھی بڑھتی گئیں بٹوارے سے
مسئلہ ختم کہاں ہو گیا دیوار کے ساتھ

داد کچھ ایسے بھی دی جاتی ہے فنکاری کی
'لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ'

اپنا تو کام ہی ٹھہرا ہے ’خبر سازی‘ کا
اپنی شام اور سحر ہوتی ہے اخبار کے ساتھ

قوم کے غم میں وہی اشک بہاتے ہیں بہت
قوم کا سودا جو کر لیتے ہیں اغیار کے ساتھ

ملک وملت کا وفادار ہوں لیکن سن لو
میں وفاداری نہیں رکھتا ہوں سرکار کے ساتھ

میرے اجداد کی یہ مجھ کو نصیحت ہے سلیم
دوستی، دشمنی جو بھی کرو معیار کے ساتھ

❖

مزاجِ اہلِ چمن پر جو بار گزری ہے
الٰہی خیر یہ کیسی بہار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ اب کے بہار گزری ہے
چمن میں ساعت نا سازگار گزری ہے

تھا زندگی کو گزرنا گزر گئی لیکن
ترے بغیر بہت بے قرار گزری ہے

کسی نے صرف ترا نام ہی لیا تھا بس
تمام رات مری اشک بار گزری ہے

نہ دل میں کوئی مسرت، نہ خواہشیں، نہ قرار
خزاں کی طرح سے اب کے بہار گزری ہے

بس ایک رات میں پتھرا گئیں تری آنکھیں
یہ کیفیت تو یہاں بار بار گزری ہے

اگر وہ حق کا طرف دار ہے تو حق گوئی
امیر شہر کو کیوں ناگوار گزری ہے

وہ بات جس کو زمانہ سراہتا ہے سلیم
نہ جانے آپ کو کیوں ناگوار گزری ہے

❖

ہمدرد و غمگسار، مسیحا کہیں جسے
ایسا کوئی تو ہو کہ ہم اپنا کہیں جسے

مجھ کو قبول کس کی غلامی ہو اور کیوں
بندہ ہوں اس کا واحد و یکتا کہیں جسے

اس دورِ بے حیائی میں ملنا محال ہے
ایسا حسین دہر میں عنقا کہیں جسے

مدت سے جستجو ہے مگر کب ملا ہمیں
اک ایسا غمگسار کہ اپنا کہیں جسے

عریانیت نے وقت کی بالغ بنا دیا
بچہ کوئی کہاں ہے کہ بچہ کہیں جسے

رہبر تمام موقع پرستی میں طاق ہیں
ان میں کوئی تو ایسا ہو اچھا کہیں جسے

ڈگری ہی کامرانی کی ہوتی نہیں سند
وہ بھی تو سیکھے کہ سلیقہ کہیں جسے

ڈھونڈا تمام شہر میں ملتا نہیں سلیم
اک حق پرست، قول کا سچا کہیں جسے

◆

ہر دم میرے پاس ہی رہنا چاہتی ہیں
بابا جلدی گھر آجانا کہتی ہیں

تنہائی میں اکثر لوری دیتی رہتی ہیں
ماں کی یادیں مجھ سے لپٹی رہتی ہیں

دل کو اطمینان بہت ہے ماں کے بعد
بہنیں مجھ کو روز دُعائیں دیتی ہیں

بیٹیاں اپنے باپ کی مجبوری کے سبب
گھٹنوں پر سر رکھ کے اکثر روتی ہیں

بہت ہوا اب گھر کو واپس لوٹ آؤ
گاؤں کی گلیاں روز صدائیں دیتی ہیں

پہروں بیٹھ کر اکثر سوچا کرتا ہوں
شہر کی سڑکیں روز لہو کیوں پیتی ہیں

گھر بیٹھے ہی جن کے چاندی بال ہوئے
وہ بے چاری جیتی ہیں نہ مرتی ہیں

❖

ڈالنا خود کو امتحان میں کیا
بھائی اس جھوٹی آن بان میں کیا

بیٹیاں پھر عذاب لگنے لگیں
جہل پھر چھا گیا جہان میں کیا

صلح کے واسطے بضد کیوں ہو
تیر باقی نہیں کمان میں کیا

کیا ہوئی آپ کی وہ حق گوئی
پڑگیا قفل اس زبان میں کیا

وہ جو اب تک وفا شناس نہیں
پاس ہوگا وہ امتحان میں کیا

ہر دعا جا کے لوٹ آتی ہے
بند ہیں راہیں آسمان میں کیا

دستکوں کا جواب خاموشی
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا

تم زمیں پر تو آ نہیں سکتے
میں ہی آ جاؤں آسمان میں کیا

تم کو اور مجھ سے عشق، حیرت ہے
اور کوئی نہیں جہان میں کیا

آؤ مجبور بن کے دیکھتے ہیں
کوئی اپنا ہے خاندان میں کیا

دل میں ہلچل سی اک بپا ہے سلیم
جانے وہ کہہ گیا ہے کان میں کیا

◆

ہوں گی نہ منظم یہ کبھی اپنی صفیں کیا
یہ سلسلۂ ظلم یونہی سہتے رہیں کیا

اب یہ نہ کرو وہ نہ کرو روز نیا حکم
می لارڈ ہمیں یہ بھی بتادیں کہ کریں کیا

ہم لوگوں کی قسمت میں نہیں اس کے سوا کچھ
آنسو نہ پئیں غم کے تو پھر اور پئیں کیا

کیوں رکھتے ہو اس دور کے حاکم سے اُمیدیں
جو سنتا نہیں سن کے بھی اب اس سے کہیں کیا

دنیا میں تو رہنے کا انہیں حق ہی نہیں ہے
وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا سے ہمیں کیا

فرعون کی سرکوبی ضروری ہے سلیم اب
برحق ہے اگر موت تو پھر اس سے ڈریں کیا

❖

نہ ہم جبیں کو نہ اب سنگ در کو دیکھتے ہیں
عقیدتا جو جھکے اس نظر کو دیکھتے ہیں

کہاں ہے منزل مقصود کیا خبر ہے کہ ہم
کبھی سفر کبھی رخت سفر کو دیکھتے ہیں

ہمیں نصیب ہیں صحرا نوردیاں یارو
نہ اپنے گھر کو نہ دیوار و در کو دیکھتے ہیں

کہاں کہاں ہیں تری عظمتوں کے گھوارے
زمین و آسماں، شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

ہے زخم زخم دل ناتواں مگر پھر بھی
بڑی اُمید سے اس چارہ گر کو دیکھتے ہیں

کبھی رفیق تھے ہمدم تھے وہ ہمارے لیے
اب ان کے لہجۂ نا معتبر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے ہیں پئے اظہار راز دل اے سلیم
ہم اپنی آہوں کے بڑھتے اثر کو دیکھتے ہیں

◆

یہی زخم عشق کے پھول تھے، یہی پھول تم نے چھپائے کیوں
جو چھپانا ان کو عزیز تھا تو یہ اشک تم نے بہائے کیوں

ہے فقیری میرے مزاج میں، وہ امیر شہر فرات ہے
نہ بلائے وہ تو میں جاؤں کیوں، بھلا وہ بھی مجھ کو بلائے کیوں

نہیں تجھ سے جب کوئی واسطہ، نہیں تجھ سے جب کوئی رسم و رہ
مرے دل میں کیسی یہ ٹیس ہے، تری یاد آ کے رُلائے کیوں

مجھے یہ تو علم تھا کم سے کم، کہ تم آشنائے وفا نہ تھے
مرے ساتھ چلنا محال تھا، مرے ساتھ ساتھ بھی پھر آئے کیوں

جنھیں پورا کرنے کی چاہ میں مری عمر ساری گزر گئی
مرے ہمنوا مجھے یہ بتا، بھلا خواب ایسے دکھائے کیوں

جو ستم بھی تھا تو یہ خوب تھا جو ادا بھی تھی تو عجیب تھی
مری انجمن میں سلیم وہ مجھے دیکھنے بھی نہ پائے کیوں

◆

لغزش سے جس کی رسوا اپنا وطن ہوا تھا
کیسا تھا وہ مسیحا، وہ کیسا رہنما تھا

اب دل میں رہ گئی ہے دھندلی سی یاد باقی
ملنا تمہارا ہم سے سچ ہے کہ خواب سا تھا

نس نس میں اس کی یادیں لگتا ہے جم گئی تھیں
رہ رہ کے میرے دل میں یہ درد جو اُٹھا تھا

تم سے بچھڑ گئے تو ہم جی نہیں سکیں گے
کیا یاد ہے کہ تم نے ہم سے یہ خود کہا تھا

اس کو سکون ملتا تو کس طرح سے آخر
اس کی وجہ سے کتنے اپنوں کا دل دکھا تھا

آئی بہو جو گھر میں بے آسرا ہوئی ماں
خوش تھی یہ سوچ کر کہ بیٹا جواں ہوا تھا

سچ کیا ہے آج ساری دنیا پہ یہ عیاں ہے
‘دہشت’ کا ورنہ اپنی چرچا بہت ہوا تھا

کتنے سروں کے جنگل اگ آئے شہر بھر میں
فرعون کے محل میں اک حشر سا بپا تھا

اس دن سے دوستوں سے محتاط ہیں بہت ہم
جس دن سے دوست بن کر اک سانپ نے ڈسا تھا

بھائی نے اپنی نظریں مجھ سے چرائی تھیں جب
اک ٹیس سی اُٹھی تھی دل تھا کہ رو رہا تھا

کس کی نظر لگی جو کمھلا گیا سلیمؔ آج
کل تک تو دل کا پودا اک دم ہرا بھرا تھا

❖

اب کسی محل پہ انصاف کی زنجیر نہیں
آج کے دور میں کیا کوئی جہانگیر نہیں

کم سے کم اس میں تو کچھ امن وسکوں رہنے دو
یہ مرا دل ہے کوئی وادئ کشمیر نہیں

اس کو اب مجھ سے جو رغبت ہے تو حیرت کیسی
اس کے ترکش میں بچا بھی تو کوئی تیر نہیں

یہ تعلق کی بحالی، یہ وفا کی تجدید
سب دکھاوا ہے حقیقی کوئی تصویر نہیں

'دیش بھکتی' کی سند مانگنے والے سن لیں
ملک سب کا ہے کسی ایک کی جاگیر نہیں

کارواں منزل مقصود پہ پہنچے کیسے
جس کی طے سمت نہیں، جس کا کوئی میر نہیں

عشق محرومِ جنوں، حسن وفا سے عاری
میں بھی رانجھا ہوں کہاں تو بھی کوئی ہیر نہیں

میں کیا کرتا ہوں ہر روز خود اپنا ہی طواف
''ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں''

مانگتا رہتا ہے، ملنے کا نہیں رکھتا یقیں
سن، دعاؤں میں تری اس لیے تاثیر نہیں

کس قدر دیکھئے معصوم ہے قاتل میرا
قتل کرتا ہے مگر ہاتھ میں شمشیر نہیں

تیرے ہر حکم کی تعمیل ضروری کیوں ہو
حاکم وقت ہے تو کاتب تقدیر نہیں

اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا ہوں اک چاند سلیم
خواب دیکھا ہے بتاتا کوئی تعبیر نہیں

❖

وہ کہتے ہیں سکندر بولتا ہے
مگر مجھ میں قلندر بولتا ہے

کوئی تدبیر کام آتی نہیں ہے
یہاں پر بس مقدّر بولتا ہے

کوئی تو راز پنہاں ہے، وگرنہ
وہ اتنا کیوں سنبھل کر بولتا ہے

اسے مت پیار کا اقرار سمجھو
وہ دنیا بھر سے ہنس کر بولتا ہے

خدا ہے ذرّہ ذرّہ میں نمایاں
سنو، اک ایک منظر بولتا ہے

ہیں کتنی داستانیں دفن مجھ میں
یہ اک خاموش پتھر بولتا ہے

شکست فاش دی ہے ہار کر بھی
بہتر کا یہ لشکر بولتا ہے

امیر شہر یوں برہم ہے اس سے
ہمیشہ سچ وہ بڑھ کر بولتا ہے

یہ تاج خسروی تم کو مبارک
یہ شاہوں سے قلندر بولتا ہے

کیا کرتا ہے اکثر رہنمائی
کوئی تو ہے جو اندر بولتا ہے

بھلائی کا ہے بدلہ اب برائی
سلیم اک شخص اکثر بولتا ہے

❖

پہنچی نہیں جہاں پہ کبھی روشنی کی حد
ہوتی ہے اس مقام تلک شاعری کی حد

ان کی نظر سے پی کے ہی مسرور ہو گئے
بس اس قدر ہی رکھی میاں میکشی کی حد

جب پہلی بار بیٹی نے 'پاپا' کہا مجھے
اس دن رہی نہ باقی کوئی بھی خوشی کی حد

پہلے تو دل سے کھیل کیا پھر مکر گئے
نزدیک ان کے ہوتی نہیں دل لگی کی حد

دینے کو ان کے پاس دُعا تک نہیں بچی
اس سے زیادہ ہوگی کوئی مفلسی کی حد

یہ کیا کہ ہر سوال پہ لب سی کے بیٹھ جاؤ
آخر کو ہونی چاہیے کچھ خامشی کی حد

ہم سوچتے تھے دوستی کی حد نہیں کوئی
اک دوست نے بتا دی ہمیں دوستی کی حد

کرتا ہے نیکیوں کو بدی میں شمار وہ
یعنی کہ اب تو ہو ہی گئی دشمنی کی حد

بہتر ہے تم کو یاد رہے حیثیت سلیم
کرتے نہیں ہیں پار میاں برتری کی حد

◆

حقیقت تو یہ ہے اپنا نہیں کچھ
بچا کر اس لیے رکھا نہیں کچھ

رہا مجبور دل سے نوع انساں
بہت سمجھایا پر سمجھا نہیں کچھ

کچھ اب کے پیاس میں شدت ہے ایسی
کہ اس کے سامنے دریا نہیں کچھ

فقط کہنے کی حد تک سب ہے اچھا
مگر سوچیں تو پھر اچھا نہیں کچھ

لٹاتا پھر رہا ہے قہقہے جو
نہ سمجھو خود پہ وہ روتا نہیں کچھ

میں دور آنکھوں سے ہوں، دل سے نہیں ہوں
غلط مت سوچ تو، ایسا نہیں کچھ

محبت سے سبکدوشی کی بابت
ابھی مصروف ہوں سوچا نہیں کچھ

جو اس کو دیکھ لے بینائی کھو دے
مری آنکھوں نے تو دیکھا نہیں کچھ

لٹا دی سلطنت عیاشیوں میں
مرے اجداد نے سوچا نہیں کچھ

یہاں سچ بات کہنا بھی غضب ہے
کسی سے اب ہمیں کہنا نہیں کچھ

سلیم اس واسطے وقعت ہے اپنی
کسی زردار سے مانگا نہیں کچھ

◆

جس قدر ممکن ہو پنہاں کیجئے
زخم دل کو مت درخشاں کیجئے

کیجئے بچوں کے سنگ اٹھکھیلیاں
اپنا گھر آنگن گلستاں کیجئے

ہو گیا کم زندگی کا ایک سال
اس خوشی میں کیوں چراغاں کیجئے

ہو چکی جور و ستم کی انتہا
لطف کا بھی کوئی امکاں کیجئے

بے قراری حد سے آگے بڑھ نہ جائے
درد دل کا کچھ تو درماں کیجئے

تم کو جینا ہے جو بچی زندگی
ظاہر و باطن کو یکساں کیجئے

دل کو خوش رکھنا ضروری ہے سلیم
پھر یہ ویرانہ گلستاں کیجئے

◆

خواب میں دیکھا جشن بپا تھا، محفل تھی، شہنائی تھی
آنکھ کھلی تو گھر میں اپنے سناٹا تنہائی تھی

جس نے دیکھا عقل و خرد سے وہ بے گانہ ہو بیٹھا
توبہ توبہ کتنی قاتل، ظالم کی انگڑائی تھی

ان کے پیار میں سب کچھ کھو کر ہم کو جو سوغات ملی
یاس و حسرت، رنج و الم، کچھ یادیں اور رسوائی تھی

سوچ کے اب بیتی باتوں کو خود پر حیرت ہوتی ہے
ان کے عشق میں کیسی ہم نے ’سدھ بدھ‘ یار گنوائی تھی

اب بیٹے کی عیاشی پر اتنا وہ حیران ہے کیوں
خود بھی جس نے باپ کی دولت دونوں ہاتھ لٹائی تھی

کیا بھائی معلوم نہیں تھے بٹوارے کے نقصانات
طیش میں آ کر آنگن میں یہ کیوں دیوار اُٹھائی تھی

اب تو بھرنا بہت کٹھن ہے گمراہی کی کھائی میاں
تبھی سنبھلنا لازم تھا جب پہلی ٹھوکر کھائی تھی

آنکھوں میں کٹتی ہیں راتیں، کس کا سونا، کیسا چین
اب تو یہ بھی یاد نہیں ہے کب میٹھی نیند آئی تھی

کل بھی ہم کو طلب کہاں تھی دولت اور شہرت کی سلیم
ماں کی شفقت اور دُعائیں اپنی اصل کمائی تھی

❖

مجھ پر نثار کرتا بھلا اپنی جان کون
میرے لیے ہے اتنا یہاں مہربان کون

ہم نے سفر کیا ہے زمیں سے فلک تلک
ہم سے زیادہ اونچی بھرے گا اُڑان کون

اس دور کو بھی اب کوئی سقراط چاہیے
اب دیکھتے ہیں دے گا بھلا امتحان کون

اس شہر میں نہیں ہے شجر دور تک کوئی
آخر مسافروں کا بنے سائبان کون

دستار گر رہی ہے گرے، سر بچا رہے
کھولے امیر شہر کے آگے زبان کون

دولت، فلیٹ، کار کی ہے حیثیت سلیم
اب پوچھتا ہے نام و نسب، خاندان کون

❖

عمر بھر کیا یونہی ستاؤ گے
اور اب کتنا آزماؤ گے

بار غم کب تلک اُٹھاؤ گے
ایک دن تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

دوست ہنستے ہیں حال دل سن کر
حال دل کس کو اب سناؤ گے

اور بڑھ جائے گی مہک ان کی
زخم دل جس قدر چھپاؤ گے

وہ تو سوکھے ہوئے درخت سا ہے
اس کو کیوں کر بھلا جھکاؤ گے

میرا دعویٰ ہے یہ، مرے اشعار
ایک دن تم بھی گنگناؤ گے

گر ہی جاؤ گے سب کی نظروں سے
کر کے احساں اگر جتاؤ گے

خوش کسی طور رہ نہیں سکتے
تم کسی کا جو دل دکھاؤ گے

یاد آتے ہی رہتے ہیں وہ سلیم
تم تو کہتے تھے بھول جاؤ گے

❖

کچھ کریں یا نہ کریں کام یہ کر جائیں گے
زیست کا قرض چکاتے ہوئے مر جائیں گے

ما سوا گھر کے ہماری کوئی منزل ہی نہیں
گھر سے نکلے ہیں تو پھر لوٹ کے گھر جائیں گے

یہ ہیں مزدور، یہی ان کا مقدر ٹھہرا
یہ تو بس بوجھ ہی ڈھوتے ہوئے مر جائیں گے

خواب کو سچ میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں
اب وہ بچے نہیں جو خواب سے ڈر جائیں گے

میری سچ بات کو جھٹلائیں گے لیکن وہ خود
جھوٹ بھی بول کے قائل مجھے کر جائیں گے

چھوڑ جائیں گے وہیں نقشِ کفِ پا اپنے
ہم سے دیوانے جدھر سے بھی گزر جائیں گے

پھر سے ہو جائے گی پہچان پرانی زندہ
دوست جس روز بلندی سے اُتر جائیں گے

ہم سے موقع جو کبھی ترک تعلق کا ملا
وہ یہ کہتا ہے نصیب اس کے سنور جائیں گے

ہم نے سوچا ہے کہ اب کوچۂ جاناں میں سلیم
جب کبھی جائیں گے بے خوف و خطر جائیں گے

❖

بہت مغرور ہوتا جا رہا ہے
یوں دل سے دور ہوتا جا رہا ہے

ہے اس کا وقتِ رخصت اور مرا دل
بہت رنجور ہوتا جا رہا ہے

دلوں سے کھیلنا پھر توڑ دینا
یہ اب دستور ہوتا جا رہا ہے

وفا کے ذکر پر چہرا تمہارا
یہ کیوں بے نور ہوتا جا رہا ہے

ہوا جب سے محبت کا اُتارا
نشہ کافور ہوتا جا رہا ہے

کیا ہے کچھ اثر آنکھوں نے اینا
کہ دل مجبور ہوتا جا رہا ہے

سلیم اب زندگی گرداب میں ہے
کنارا دور ہوتا جارہا ہے

◆

مسئلہ تخت کا نہ تاج کا ہے
مسئلہ آج کے سماج کا ہے

کیسی جمہوریت کہاں کے اصول
نشہ اس کو تو اپنے راج کا ہے

ہے سراسر سماج کا دشمن
آج جو رہنما سماج کا ہے

مسئلہ یہ نہیں کہ کم ہے اناج
مسئلہ سڑ رہے اناج کا ہے

کیسی تشویش ملک و ملت کی
سارا جھگڑا تو تخت و تاج کا ہے

خود کو رکھے روایتوں کا امیں
فرض یہ بھی تو اک سماج کا ہے

سب پہ کھلتا نہیں بہ آسانی
آدمی وہ عجب مزاج کا ہے

فکر کل کی کریں گے کل ہی سلیم
پہلے جو معرکہ ہے آج کا ہے

❖

اشک، آہیں، یاس، شکوا رہ گیا
زندگی میں اور اب کیا رہ گیا

ہوگئی ان کی مسیحائی تمام
زخم دل گہرا تھا رستا رہ گیا

ریت کے تھے خواب سارے بہہ گئے
پتھروں پہ نام لکھا رہ گیا

وہ ہے قصہ گو جہاں ہے اس کے ساتھ
میں نے سچ بولا، میں تنہا رہ گیا

جس کو ہم سمجھا کیے اپنا عدو
بس وہی اک شخص اپنا رہ گیا

روح تو پرواز کب کی کرچکی
عشق، جسموں کا تماشا رہ گیا

مقبرے تاریکیوں میں گم ہوئے
خانقاہوں میں اُجالا رہ گیا

کیا کہیں اس دور کا ہر آدمی
آدمیّت کو ترستا رہ گیا

عمر بھر ان کو یقیں آیا نہیں
میں وفا کا دم ہی بھرتا رہ گیا

چل دیا منہ پھیر کے وہ اے سلیم
اور میں بس اس کو تکتا رہ گیا

❖

دل میں چھپا کے اپنے سبھی غم رکھا کرو
چہرا شگفتہ پھول سا ہر دم رکھا کرو

نازک ہیں دل کے زخم یہ تحفہ ہیں، پیار کا
ان پہ ذرا سنبھال کے مرہم رکھا کرو

بیٹھے بٹھائے ہوگئی تشہیر عشق کی
کس نے کہا تھا آنکھ کو یوں نم رکھا کرو

ہوں اپنے عیب اپنی نظر میں تو خوب ہے
اوروں کی خامیوں پہ نظر کم رکھا کرو

آپس میں اختلاف کا نقصان ہے بہت
ہاتھوں میں اتحاد کا پرچم رکھا کرو

ماحول حق بیانی کے حق میں نہیں سلیم
گردن عزیز ہے تو اسے خم رکھا کرو

⁂

یہ کیا ستم ہے مری شام کی سحر بھی نہ ہو
تمام عمر کی محنت کا کچھ ثمر بھی نہ ہو

وہ جس کو جادۂ منزل کی کچھ خبر بھی نہ ہو
سفر میں ایسا کوئی یار ہم سفر بھی نہ ہو

جو اعتماد کے باعث ہو گمرہی کا سبب
کوئی ہمارے لیے اتنا معتبر بھی نہ ہو

دُعائیں ماں کی بہت کام آئیں گی بھائی
جو تپتی راہ گزر میں کوئی شجر بھی نہ ہو

دُعا یہ ہے نہ دکھائے خدا مجھے وہ دن
میں اپنی جان سے جاؤں، اسے خبر بھی نہ ہو

میں اس کو بھولنے کی کوششیں بھی کرتا رہوں
دُعا کو ہاتھ بھی اُٹھیں مگر اثر بھی نہ ہو

سلیم اتنا تو محتاط رہ کہ تیرا حریف
جو تجھ سے زیر نہ ہو پائے تو زبر بھی نہ ہو

❖

نام حق دنیا میں روشن کر گیا
طشت میں سج کر جو میرا سر گیا

کتنے ہی چہرے سوالی ہوگئے
لوٹ کر جلدی جو اپنے گھر گیا

جرم کے احساس کا مارا ہوا
رات اپنے سائے سے بھی ڈر گیا

گردشِ ایام تیرا شکریہ
مجھ میں اک انسان تھا سو مر گیا

ظلم و تانا شاہی اب بھی عام ہے
کون کہتا ہے کہ ہٹلر مر گیا

مجھ سے برہم ہے امیر شہر پھر
ایسا لگتا ہے کہ اب کے سر گیا

بعد مدت کے سلیم اک روز جب
آئینہ دیکھا تو خود سے ڈر گیا

❖

گھر میں پھر اک نئی دیوار کی باتیں مت کر
ضبط سے کام لے تکرار کی باتیں مت کر

آج کے دور میں معیار سے گرنا ہے ہنر
آج کے دور میں معیار کی باتیں مت کر

اپنے بچوں کو فتوحات کے قصے تو سُنا
سامنے ان کے کبھی ہار کی باتیں مت کر

دوستی، پیار، وفا، جذبۂ ایثار و خلوص
چھوڑ بھی یار یہ بے کار کی باتیں مت کر

یہ نئی نسل ہے نا واقفِ اقدار سلیم
اس سے قربانی و ایثار کی باتیں مت کر

❖

ہم بھی دیکھیں رہ جاتے ہیں آخر کیسے خالی ہاتھ
صدق دلی سے پھیلاؤ تو اس کے آگے خالی ہاتھ

آہیں، آنسو، یاس، کسک، کیا یہ سب کم سوغاتیں ہیں
کون یہ کہتا ہے کہ اس کے در سے آئے خالی ہاتھ

اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ تو کیجے آپ
سارے دن مزدوری کر کے جو لوٹ آئے خالی ہاتھ

ایک ہی سوکھا ٹکڑا تھا بس اس پر کوا جھپٹ پڑا
کمسن بچہ دیکھ رہا ہے چونک کے اپنے خالی ہاتھ

دنیا میں ویسے تو آئے کتنے ہی قارون میاں
لیکن جب دنیا سے لوٹے تو سب لوٹے خالی ہاتھ

کتنی بھوکی نظریں اس کی جانب اُٹھ جاتی ہیں سلیم
جب کوئی معصوم جوانی پھیلاتی ہے خالی ہاتھ

◆

جس میں ناکردہ گناہوں کی سزا دی جائے
ایسی جمہور کی تاریخ مٹا دی جائے

چار سو دیکھا ہے پھر امن و اماں کا عالم
میرے اس خواب کی تعبیر بتا دی جائے

کارواں جس کی حفاظت میں لٹے ہوں اکثر
ایسے رہبر کو سرِ عام سزا دی جائے

مفلسِ شہر کے تن پر ابھی باقی ہے قبا
یورشِ ظلم ابھی اور بڑھا دی جائے

ظالمِ شہر تو بیٹھا رہے حکّام کے ساتھ
ظلم سہنے کی مگر ہم کو سزا دی جائے

منصفِ وقت ملوث ہے جرائم میں سلیم
یہ حقیقت کی ہے آواز دبا دی جائے

❖

دریا، جھیل، سمندر، چپ
دھرتی کے سب منظر چپ

کچھ تو بولو کیسے ہو
کیوں رہتے ہو اکثر چپ

میرے حال کو سن کر وہ
ہو جاتے ہیں ہنس کر چپ

کچھ انہونی بات نہ ہو
دلہن کا ہے زیور چپ

مولا خیر ہو ساحل کی
کیوں ہے آج سمندر چپ

قتل انساں دیکھ کے آج
مسجد، گرجا، مندر چپ

اک دن وہ بھی آئے گا
رہ نہ سکے کا خنجر چپ

حق گوئی کی بات پہ آج
صوفی سنت قلندر چپ

بت جب سے بھگوان بنے
اس دن سے ہے آزر چپ

منزل تک پہنچائے کون
سارے میل کے پتھر چپ

اجہل کی محفل میں سلیم
خوش رہتے ہیں رہ کر چپ

◆

دیکھو دل کو یوں مت توڑو صبح و شام مسلسل تم
روز کا جھگڑا ٹھیک نہیں ہے سوچو کوئی تو حل تم

بکھری زلفیں، بھیگی پلکیں، اُترا چہرا، لب خاموش
میرے ہمدم یہ تو بتاؤ، کیوں ہو غم سے بوجھل تم

تم کہتے تھے ساتھ ہمارا ہر صورت، ہر روپ میں ہے
سانپ کہا ہے مجھ کو تو، پھر خود بن جاؤ صندل تم

وقت نے دل کی جھیل پہ کائی بن کے ڈیرا ڈال دیا
یادوں کے پتھر برسا کر آؤ مچا دو ہلچل تم

تم بھی اپنی ضد پر قائم میں بھی اپنی ذات میں گم
ہم کو اب یہ کون بتائے پاگل میں یا پاگل تم

آؤ مل کر اس دکھیاری دنیا کے دُکھ دور کریں
میں جھونکا بن جاؤں ہوا کا اور برستا بادل تم

کاش کہ پھر سے لوٹ کے آئے بے فکری کا دور سلیم
میرے ہونٹوں پر ہو نغمہ اور چھنکاؤ پایل تم

◆

کس کا جلوہ ہے یہ کس شوخ کی انگڑائی ہے
دید سے جس کی ستاروں کو بھی نیند آئی ہے

بجلیاں جسم میں آنکھوں میں شرارت توبہ
ہائے کیا خوب قیامت کی ادا پائی ہے

ایسے اٹھلاتی ہوئی پھرتی ہے گلشن میں صبا
جیسے خوشبو کسی آنچل کی چرا لائی ہے

بغض و نفرت کے اندھیروں کو مٹانا ہوگا
آج کی صبح یہ پیغام نیا لائی ہے

کیسا چھایا ہے زمانے پہ یہ ہو کا عالم
ہر طرف بغض و کدورت کی گھٹا چھائی ہے

برف کی طرح پگھلتا رہا لمحہ لمحہ
موت بھی آئی تو قسطوں میں مجھے آئی ہے

گلۂ دوریٔ منزل نہیں تجھ کو ہی سلیم
یہ رہِ عشق بھلا راس کسے آئی ہے

⁂

سوچتا ہوں گر تمہارا آسرا مل جائے گا
لڑکھڑاتی زندگی کو حوصلہ مل جائے گا

رنجشیں مل جائیں گی، مکرو ریا مل جائے گا
اور اب دورِ ترقی تجھ سے کیا مل جائے گا

جس ہتھیلی کو حنا بخشی ہے میں نے پیار کی
نام میرا اس ہتھیلی پر لکھا مل جائے گا

پھر نہ پوچھو گے کبھی میری اداسی کا سبب
جب تمھیں بھی دوست کوئی بے وفا مل جائے گا

وہ ابھی تک گمرہی کی راہ پر ہیں گامزن
سوچتے ہیں جو کہ پتھر میں خدا مل جائے گا

ٹوٹ سکتا ہے طلسم آئینہ سازی جبھی
جب مقابل آئینے کے آئینہ مل جائے گا

سنتے ہیں تاریخ دوہراتی ہے اپنے آپ کو
ایک دن پھر آدمی بکتا ہوا مل جائے گا

مسکرا کے اس نے میری سمت دیکھا پھر سلیم
ایسا لگتا ہے کہ کوئی غم نیا مل جائے گا

❖

روشنی کو کیا ہوا کیوں تیرگی ہونے لگی
کیوں تمدن کے چراغوں کی کمی ہونے لگی

برق کوندی ذہن و دل میں روشنی ہونے لگی
جب خیال آیا تمہارا شاعری ہونے لگی

اب قریب المرگ اپنی زندگی ہونے لگی
ان کی چشم لطف میں جب سے کمی ہونے لگی

محو حیرت آج کا فنکار آخر کیوں نہ ہو
جب خیالی پیکروں کی بندگی ہونے لگی

گھر جو میں نے پھونک ڈالا تو برا کیا کردیا
گھر میں میرے روشنی کی جو کمی ہونے لگی

دوستوں میں اب وہ پہلی سی وفاداری کہاں
دوستی کے نام پر اب دشمنی ہونے لگی

منحرف ہو کر خدا سے بن گیا شیطان جو
آج انسانوں میں اس کی پیروی ہونے لگی

اس ترقی یافتہ دنیا میں اب تو اے سلیم
رہبری رسماً، رواجاً رہزنی ہونے لگی

◆

کسی کو دوست جب اپنا حریف لگتا ہے
تو پھر خلوص بھی نیز لطیف لگتا ہے

نہ جانے کتنے جرائم ہیں اس میں پوشیدہ
وہ آدمی جو بظاہر شریف لگتا ہے

جو انگلیوں میں پہنتا ہے نیلم و پکھراج
وہ اعتقاد کا مجھ کو ضعیف لگتا ہے

ہے جس کے لب پہ زمانے کی والہانہ ہنسی
اسی کے دل میں کوئی غم طریف لگتا ہے

ہزاروں غم ہیں اس اک دل میں غور سے دیکھو
سلیم تم کو بظاہر ظریف لگتا ہے

◆

زمیں کو آسماں باطل کو حق نما نہ کہو
کسی بھی خوف سے رہزن کو رہنما نہ کہو

مرے جنوں کو مرے ضبط سے سوا نہ کہو
یہ ابتدائے محبت ہے انتہا نہ کہو

مریض عشق کے آنسو زبان ہوتے ہیں
زباں سے لاکھ اگر عرض مدعا نہ کہو

وفا پرست رہوں گا وفا پرست ہوں میں
مری وفاؤں کو مکاری و ریا نہ کہو

صدائیں آتی ہیں ایسی کہ دل دہل جائے
غزل کا شعر کہو جو بھی عاشقانہ کہو

چمن کا حال نہ ہم کو سنائیں اہل چمن
قفس میں ہم نے گزارا ہے اک زمانہ کہو

جو دیکھ لے ہے انہیں اپنے ہوش کھوئے ہے
وہ ایسی آنکھیں ہیں جن کو شراب خانہ کہو

سلیم جو غم جاناں میں اشک بہتے ہیں
غمِ حیات کا انمول اک خزانہ کہو

◆

کس طرح بکھرا مرے خوابوں کا منظر دیکھنا
تم بھی اک دن پھینک کر دریا میں پتھر دیکھنا

جو تخیل کی حدِ پرواز سے ہے بالا تر
چاہتا ہے دل مرا کیوں اس کو اکثر دیکھنا

ہو نہ ہو اس میں کوئی تو راز پنہاں ہے ضرور
دفعتاً مجھ کو تمہارا مسکرا کر دیکھنا

چھوڑ دو فرقوں کی باتیں، توڑ دو رسم ورواج
چاہتا ہوں میں سبھی کو اک برابر دیکھنا

دوستی کا آج دعویٰ کر رہے ہیں جو سلیم
آستینوں میں انھیں لوگوں کے خنجر دیکھنا

◆

بدلی ہوئی ہے گردش حالات کس قدر
مشکل ہے آج ان سے ملاقات کس قدر

ہم پر تھی سنگ طنز کی برسات کس قدر
تلخی بھری تھی ان سے ملاقات کس قدر

میں نے جو ان کو اپنا سر بزم کہہ دیا
گزری ہے نا گوار مری بات کس قدر

یہ سرد سرد رات یہ ماضی ورق ورق
ہیں جان لیوا یاد کے لمحات کس قدر

اس کے کرم کے ہم تو یوں ہی منتظر رہے
غیروں پہ کی ہیں اس نے عنایات کس قدر

گزرے تھے تیری زلف کی چھاؤں میں جو کبھی
تڑپا رہے ہیں آج وہ لمحات کس قدر

پہلے سکوں تھا آج ہے ہر لمحہ رنج و غم
بگڑے ہوئے ہیں شہر کے حالات کس قدر

احباب سارے ہم سے جدا ہو گئے سلیم
مہنگی پڑی ہے عشق کی سوغات کس قدر

❖

زندگی کامل نہیں جیسے عبادت کے بغیر
کامرانی مل نہیں سکتی شہادت کے بغیر

تجھ سے جب بچھڑے تو ہم پر راز یہ افشا ہوا
زندگی بے کار ہے تیری محبت کے بغیر

تو سمجھتا تھا کہ تیرے بن نہ جی پائیں گے ہم
دیکھ لے زندہ ہیں ہم تیری عنایت کے بغیر

مفلس و نادار کی بیٹی کو اپنائے گا کون
حسنِ سیرت رائیگاں جائے گا دولت کے بغیر

صورتِ تابندہ ہونا ہی تو بس کافی نہیں
آدمی کب آدمی ہے اچھی سیرت کے بغیر

یہ بجا تدبیر سے قسمت چمکتی ہے، مگر
رنگ لاتی ہے کہاں تدبیر قسمت کے بغیر

زر کے بل بوتے پہ تو اعزاز ملتے ہیں بہت
ہے وہی اعزاز جو ملتا ہے دولت کے بغیر

کس قدر یہ قول سچا ہے بزرگوں کا سلیم
کچھ بھی حاصل ہو نہیں سکتا ریاضت کے بغیر

تغیّر

بیس سال پہلے جب
میں نے اس حسینہ سے
اعتراف الفت کا
روبرو کیا تھا تو
کپکپاتے لفظوں میں
اس کی چاہ میں خود کو
یوں اسیر پایا تھا
جیسے کوئی پروانہ
شمع کی محبت میں
رات بھر تڑپتا ہے
اور اس محبت میں
اپنی بھینٹ دیتا ہے

میں نے اس حسینہ سے
کرلیا تھا یہ وعدہ

عمر بھر نبھاؤں گا
میں وفا کی یہ رسمیں
میری بات سن کر وہ
کھلکھلا اٹھی تھی اور
کس ادا سے بولی تھی
عمر بھر نبھانے کے
کھوکھلے ہیں سب دعوے
کون ساتھ دیتا ہے
آج کے زمانے میں
جذبۂ محبت بھی
دھند کی طرح ہے جو
تیز دھوپ چڑھتے ہی
کھو کہیں پہ جاتا ہے
اب کہاں کوئی مجنوں
اب کہاں کوئی فرہاد
آج کل کے عاشق تو
”پارٹ ٹائمر“ ہیں سب
چند دن محبت کے

گیت گنگناتے ہیں
اور بھنورے کی صورت
چوس کر کلی کا رس
قہقہے لگاتے ہیں
اور پھر گلستاں میں
اک نئے سہارے کی
اک نئی محبت کی
پھر ''الکھ'' جگاتے ہیں

تب کہا تھا یہ میں نے
وقت ہی بتائے گا
ان وفا کی راہوں پر
کون کتنا صادق ہے
بیس سال گزرے اور
میں نے دل کی نگری میں
اس حسیں کی یادوں کو
اس طرح چھپا رکھا
جس طرح کوئی خوشبو

گل میں قید رہتی ہے
میں کبھی بھی اک لمحہ
اس جفا کی دیوی کو
بھول ہی نہیں پایا
اور اس کی چاہت کو
دل کی دھڑکنوں کے ساتھ
باندھ کر سدا رکھا
آج دفعتاً اس سے
سامنا ہوا تو وہ
دیکھتی رہی کچھ پل
اور پھر وہ یوں بولی
معذرت طلب ہوں میں
آپ کو نہ پہچانا
شکل یاد ہے لیکن
نام اپنا فرمانا
اس کے اتنا کہنے پر
دل پہ شاق سا گزرا
تھرتھرائے لب میرے

اور یوں کہا میں نے
میں سلیم ہوں جاناں
ہاں وہ بھنورا جو اب تک
اک کلی پہ مرتا ہے
یاد اس کو کرتا ہے
اپنے غم میں جلتا ہے
میری بات سن کر وہ
ہچکچائی پھر بولی
وہ کلی تو مدت سے
پھول بن چکی ہے اور
اس نے اپنے ماضی کو
بھول کر زمانے کی
حالیہ روایت پر
سیکھا ہے عمل کرنا
''اچھا تو خدا حافظ
آپ سے گزارش ہے
پھر کبھی نہ ملئے گا''

تشدّد

کبھی بزرگوں سے یہ سنا تھا
حقیر ناچار، بے بسوں کی
علیل، معذور و ناتواں کی
مزاج پرسی و چارہ جوئی
کسی عبادت سے کم نہیں ہے
کہ اس زمیں پر کوئی بھی مذہب
تشددوں کا نہیں ہے قائل
وہ رام ہوں، کرشن ہوں کہ نانک
فرید، چشتی ہوں یا کہ گاندھی
سبھی نے الفت کا درس دے کر
پیام انسانیت دیا ہے

مگر ہمارے چمن میں اب کے
نہ جانے کیسی ہوا چلی ہے

اُداس ہیں مسجدوں کے گنبد
منارِ گرجا لرز رہے ہیں
شوالیہ کے کلس فضا میں
بدلتے منظر کو تک رہے ہیں

وہ لو چلی اب کے نفرتوں کی
چمن کا ہر گل جھلس گیا ہے
سیاسی مذہب پرستیوں کے
ہوئے ہیں شعلے بلند ہر سو
جہاں بھی جاؤ، جدھر بھی دیکھو
وہاں ہے ابلیس کا تسلط
اور آدمیت تڑپ رہی ہے
نظام گلشن بدل رہا ہے
یوں لگ رہا ہے نئی صدی میں
تشدد و قتل عام ہوگا
اُگے گی فصل آدمی کی، لیکن
زمیں پہ انسان ہی نہ ہوگا

6 دسمبر کی عید

چھ دسمبر بھی ہے اور عید بھی ہے
یہ ہے کیسا عجیب اتفاق
اک طرف سوگِ بابری مسجد
اک طرف دل کو ہے غمِ گجرات
سوچتا ہوں کہ غم مناؤں یا
عید کی لذتوں میں کھو جاؤں
خود کو خوشیوں میں غرق کر لوں میں
یا کہ ماضی کی طرح پھر اس سال
باندھ کر ہاتھ پر سیاہ پٹی
اپنے زخموں کو پھر ہرا کر لوں
سوچتے سوچتے مگر اک دم
ذہن میں یہ سوال اُٹھتا ہے
عید کے دن بھی گر جو سوگ کیا
نہ بدل جائیں عید کے معنی
عید تو نام ہی ہے خوشیوں کا
راحت وفرحت ومسرت کا
عید کے روز پھر یہ ماتم کیوں؟

'وہ' جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے
'اس' کی ہر بات میں بھلائی ہے
کون جانے کہ مصلحت کیا ہے؟
آج کے دن جو عید آئی ہے
یہ بھی ممکن ہے مالک و معبود
چاہتا ہو کہ چھ دسمبر کو
ختم اب غم کا سلسلہ کر دیں
یہ بھی ممکن ہے کہ اشارہ ہو
جلد ہی فتح وکامرانی کا
کفر کے بازو ٹوٹ جانے کا
حق کی باطل پہ کامیابی کا
کیوں نہ پھر یہ ہماری سوچ رہے
ذہن میں رکھیں نا اُمیدی کیوں
جب کہ خالق کو ہے یہی منظور
چاہتا ہے جو وہ منائیں عید
سوگ کی رائیگاں ہے ہر تمہید
چھ دسمبر ہے اور عید بھی ہے
اس حقیقت کو ہم کریں تسلیم

6دسمبر 2002

کتنے اچھے لگتے ہیں

کالی زلفیں
نیلی آنکھیں
اس کی باتیں
سب سوغاتیں
کتنے اچھے لگتے ہیں
چاندی کا تن
اجلا سا من
چنچل چتون
سب پیراہن
کتنے اچھے لگتے ہیں
یاقوتی لب
چہرے کی پھب
ہنسنے کا ڈھب
دل کو یہ سب

کتنے اچھے لگتے ہیں
لمبے بال
گورے گال
اس کی چال
جاہ و جلال
کتنے اچھے لگتے ہیں
سر پر آنچل
آنکھ میں کاجل
گال میں ڈمپل
ہنسنا پل پل
کتنے اچھے لگتے ہیں
من کا میت
اس کی پریت
سر سنگیت
پیار کے گیت
کتنے اچھے لگتے ہیں

بے ضمیری کا مرثیہ

وہ قوم، جس کی
شجاعت و جرأت کا زمانہ معترف تھا
عیش و عشرت
مسلکی منافرت
بغض و عداوت
کی دلدل میں پھنس کر
اس قدر بزدل و بے حس ہوگئی
کہ اس کی تلواریں کند ہوگئیں
اور پھر دنیا نے دیکھا
ظالموں کا لشکر
ان پر ٹوٹ پڑا
ماؤں، بہنوں، بچوں اور بزرگوں کی
لاشیں جابجا بکھر گئیں
حرمت انساں پامال ہوئی
اور حق کے تمام علمبردار
اپنے ایوانوں میں بیٹھے

سلیم صدیقی

موت کی تباہی کا
LIVE ٹیلی کاسٹ دیکھتے رہے
اور پھر یہود و نصاری کی
جے جے کار کے نعرے گونج اٹھے
اسلامی پرچم کی جگہ
نصرانی پرچم لہرا گیا
ضمیر کل بھی مردہ تھے
آج بھی مردہ ہیں
اور ان کے جاگنے کی
کوئی امید بھی نہیں
اب عراق کے بعد کون؟
مصر--
شام---
لیبیا----
ایران-----
اور پھر------
یہ سلسلہ کہاں ختم ہو گا؟

آدمیّت

اب کہاں
پیار والفت کی وہ چاشنی
اب ترستا ہے دل
سچے جذبات کو
پاک احساس کو
چاہتوں کو
محبت کی بو باس کو
اب تو مفقود ہے جیسے جنس وفا
اب زمانے میں بے لوث رشتے کہاں
مصلحت کا لبادہ ہے ہر ذہن پر
جانے پچھلی روایات کیا ہوگئیں
نوع انساں میں باقی ہے سب کچھ مگر
بس روایات انسانیت کھوگئیں

ذہن و دل
رابطے تک کے حامی نہیں
اور سب کا ضمیر
اپنے اپنے مفادوں کا محتاج ہے
نفرتیں، رنجشیں، دوریاں، فاصلے
بغض و مکر و ریا
نوعِ انساں کی عادت بنے
آدمی آدمیت سے خارج ہوا
جس سے ابلیس تک
آج ہے شرمسار
اور۔۔۔۔
مجبور ہے آدمی

سرحد

دور تا حد نظر
خاکی وردیوں
کالے بوٹوں کی باڑ، اس پار
دیکھنے کی اجازت کب دیتی ہے
اور میں ہر روز سرحد تک جا کر
مایوس لوٹ آتا ہوں
لیکن ۔۔۔۔
لیکن پھر اگلے روز
نئی امید کے ساتھ
آنکھوں میں چراغ جلائے
وصل کی خواہش لئے
اسی سمت
چل پڑتا ہوں لیکن ۔۔۔۔
میری پتھرائی آنکھوں کو
سنگینوں کی نالیں
کٹیلے تاروں کی باڑ

ریت کے بوروں کی بے وجود دیوار

اس پار
دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی

رات کو بستر پر دراز
چاند میں کسی کا
حسین چہرہ تراشے
خوابوں کی دنیا میں مگن
آسماں تاکتا ہوں
تب ہی کمرے کے سناٹے کو
فون کی تیز ‘‘بیل’’
کھدیڑ دیتی ہے
اور میں لپک کر
چوگا اٹھائے
پھر اسی مترنم آواز کا جادو
اپنی سماعت میں
بکھرنے کا انتظار کرتا ہوں

سانسوں کے زیر و بم

جذبات کی تپش جسم کی سوندھی خوشبو
زلفوں کی مہک
آنکھوں کی کشش
محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہوں
وہی خاموشی
وہی سناٹا
وہی تیرگی
لیکن----
فون کی خاموشی میں
محسوس کرتا ہوں
کوئی آواز میرے کانوں میں
رس گھولنے کو
بے تاب سی ہے، مگر
لبوں کے حصار توڑ کر
باہر نکلنے کی
جرأت نہیں کرتی
کچھ پل بعد
ایک لمبی ‘‘بیٹ’’
رابطہ منقطع ہو جانے کا

اعلان کرتی ہے
دل بیٹھنے لگتا ہے
چوگا ہاتھوں سے
چھوٹ جاتا ہے
میں پھر سرحد پار
خلا میں
گھورنے لگتا ہوں
لیکن----
دور تا حد نظر
سوائے کہرے
دھند
اور تیرگی کے
کچھ نظر نہیں آتا

ذہن میں ماضی کے اوراق
یادوں کی تیز آندھی سے
پھڑپھڑانے لگتے ہیں
جب اس نے
اپنے ہاتھوں میں

میرا ہاتھ لئے
سرحد کے اس پار
لوٹنے کی
سوگندھ کھائی تھی
اور
انتظار کا
قول لینے کو
اپنی حنائی
ہتھیلیاں پھیلائی تھیں
میں
اسی دن سے
سرحدوں کے اس بھنور میں
پھنسا ہوا ہوں
نہ جانے کب تک
یہ سرحدیں
یونہی سر اٹھائے کھڑی رہیں گی؟
کب
جسم و دل کے
یہ فاصلے مختصر ہوں گے

نہ جانے کب تک
میرے فون کے چوگے میں
اس کی مترنم آواز
گونجے گی اور
میرے کانوں میں
رس گھول کر
دم توڑتی آرزوؤں کو
جلا بخشنے........
فاصلوں کو
تحلیل کرنے کا پیغام دے گی

اسی ایک لمحہ کی تلاش
میری زندگی کا مقصد
میری پرستش کا صلہ
میری چاہت کا
انعام ہوگا
مگر........؟
آخر کب
یہ سرحدیں ٹوٹیں گی؟

زرد آندھی

اب کے برس
اس شہر میں
یوں نفرتوں کی لو چلی
تن من ہی کیا
روحیں جھلس کر رہ گئیں
حیوانیت کی آگ میں
کچھ جل مرے
کچھ بچ گئے
کچھ ‘زندہ مردہ’ ہو گئے
ظلم و ستم کی یورشیں
اتنی بڑھیں کہ چار سو
آہ و فغاں کا شور تھا
اور آدمی مجبور تھا
گاندھی کی سرزمین پر
رقصاں ہوئے تھے گوڈسے

تھرا اٹھا پورا وطن
جلنے لگا سارا چمن
حیران ہیں گنگ و جمن
رسوا ہوئی انسانیت
اور آدمیت کا لباس
کیسے ہوا ہے چاک چاک
سب کا یقین و اعتماد
آج چور چور ہے
کیوں ڈر رہا ہے آدمی
خود اپنے سائے سے ہی اب
اور بٹ گئی ہیں بستیاں
ہندو مسلمانوں کے بیچ
یہ 'زرد' آندھیاں اگر
روکی نہ جا سکیں تو پھر
ویران ہوگا آشیاں
جنت نشاں ہندوستاں

حقوق العباد

میں نے حق داروں کو
ان کے حق سے محروم کر کے
قہقہے لگائے
عیش کئے
اور اپنے اس کارنامہ پر
خود ہی اپنے آپ کو
داد و تحسین سے
نوازتا رہا
دوسروں کو حقوق العباد
ادا کرنے کی
تلقین کرتا رہا اور
خود اللہ کے بندوں کے
حقوق کو دباتا رہا
آخر
ایک دن

پھر یوں ہوا
میں اپنے تمام حقوق سے
محروم کر دیا گیا
اب میں ان
مستحقین میں تھا
کل
جن کے حقوق کو میں
دباتا رہا تھا
میرے حقوق ادا کرنے کو
وہ بے تاب تھے
اور میرا سر
ندامت سے جھکا تھا
زمانہ مجھ پہ
ہنس رہا تھا

حکیم عبدالحمید

عظمت و ایثار کا محور گیا
فخر انساں اور، انساں گر، گیا

یاد کیجے روئیے کیا فائدہ
اک عظیم المرتبت رہبر گیا

رہتی دنیا تک رکھا جائے گا یاد
کام ہی وہ شخص ایسا کر گیا

عالمِ تعلیم افسردہ سا ہے
علم اور دانش کا اک شہپر گیا

جس کو کہتے ہیں حکیم عبدالحمید
عالم فانی سے پردہ کر گیا

قطعات

ماں

فقیروں کو کبھی بھی مال وٓ زر اچھا نہیں لگتا
جو جھک جائے ہر اک در پر وہ سر اچھا نہیں لگتا
ہمیشہ ڈھونڈتی رہتی ہیں آنکھیں چار سو ان کو
حقیقت یہ ہے کہ بن 'ماں' کے گھر اچھا نہیں لگتا

دہشت گرد

بھٹک گئے جو سیدھی سچی راہوں سے
ان کو راہ راست پہ لایا جائے گا
دہشت کو دہشت سے مٹانا مشکل ہے
دہشت کو حکمت سے مٹایا جائے گا

ظلِّ الٰہی

آج کی اوچھی سیاست نے کیا ہے یہ کمال
جو سپہ سالار تھے کل تک سپاہی ہو گئے
اس بدلتے دور نے کیا کیا بدل ڈالا سلیم
ایرے غیرے شہر میں ظلِ الٰہی ہو گئے

مصلحت

ہمیں معلوم ہے اکثر شرارت کون کرتا ہے
شرافت کس کا شیوہ ہے ذلالت کون کرتا ہے
نقابیں مصلحت کی ڈال رکھی ہیں میاں سب نے
اصول اور ضابطے کی اب سیاست کون کرتا ہے

حق بیانی

حق بیانی کی سزا کیا تجھے معلوم نہیں
سادھ لے چپ جو بنانا ہے مقدر اپنا
حاکمِ شہر سے یہ حکم ملا ہے کہ سلیم
فکر دستار نہ کر پہلے بچا سر اپنا

صاحب کردار

ظلم و ستم کا جن کے زمانہ ہے معترف
حاکم تمام ان کے طرف دار ہوگئے
اللہ رے سلیم بہ فیض سیاسیات
قاتل تمام صاحبِ کردار ہوگئے

امیرالمومنین

خود کو کہلاتے ہیں جو اب بھی امیرالمومنین
مومنو کے قتل و خوں پر کس لیے خاموش ہیں
کفر کا لشکر بڑھا جاتا ہے سوئے کربلا
اور حق کے مدعی جو ہیں وہ سب خاموش ہیں

حسینی طاقتیں

خطۂ کرب و بلا میں ایک مدت بعد پھر
ہو گئیں سرگرم دیکھو پھر یزیدی طاقتیں
کفر کو ارض مقدس سے مٹانے کے لیے
کیوں نہیں ہیں متحد آخر حسینی طاقتیں

ساقی

جو ہوا سو ہو چکا اب یہ کہانی ختم کر
ظرف کم ہے جس کا اُس کو جام ساقی اب نہیں
مل رہی ہیں مسندیں لعل و جواہر کے عوض
ادنیٰ و اعلیٰ میں کوئی فرق باقی اب نہیں

اردو

حق کی آواز تمدن کا نشاں ہے اردو
اپنے ہی گھر میں مگر محوِ فغاں ہے اُردو
انگلیاں اس پہ تعصب کی اُٹھانے والو
نور و چکبست کی ملاؔ کی زباں ہے اُردو

نوٹ: کرشن بہاری نور، برج برائن چکبست، آنند نرائن ملاؔ

انقلاب

پھر مری دنیائے اردو پر شباب آنے کو ہے
اب تلک کوئی نہ تھا پر اب جواب آنے کو ہے
اس لیے محتاط رہنے کی ضرورت ہے سلیم
سن رہے ہیں شہر میں پھر انقلاب آنے کو ہے

ارجن

ہوا ہے ملک میں جمہوریت کا ’’چیر ہرن‘‘
چہار سمت مسلط ہیں آج ’’دریودھن‘‘
اب ایک اور کروکشیتر کی ضرورت ہے
کماں سنبھال، اُٹھا تیر اور ’’ارجن‘‘ بن

رہبر

سیاہ دل ہے سیاہی کا پاس رکھے ہے
بدن پہ اپنے چمکتا لباس رکھے ہے
جو گھر سے اپنے نکلتا ہے سخت پہرے میں
عوام اس سے تحفظ کی آس رکھے ہے

دلّی والے

وہی باتیں، وہی لہجہ، وہی سوچیں، وہی قصّے
وہی راتوں کو اکثر بیٹھنا گلیوں میں تھلّوں پے
بدلتی جا رہی ہے ہر گھڑی تصویر دلّی کی
مگر جو دلّی والے ہیں وہ بالکل بھی نہیں بدلے

اپنا

کسی بھی وقت گھر آؤں کوئی اب کچھ نہیں کہتا
کبھی وہ دن تھے جب میں دیر سے آتا تو ڈرتا تھا
مصیبت میں ہوئی جب آزمائش تب یہ ہم جانے
جسے اپنا نہیں سمجھا وہی اک شخص اپنا تھا

فطرت

کسی کے ہمنوا، ہمراز تھے، ہمدم تھے، اپنے تھے
کبھی وہ دن بھی تھے جب ہم انگوٹھی کے نگینے تھے
بوقت آزمائش راز یہ ہم پر کھلا آخر
جنھیں اپنا سمجھتے تھے وہ فطرت سے کمینے تھے

صدام حسین

جس کا ثانی نہیں کوئی، نہ کوئی جس کی مثال
دین حق کا وہ علم دار تھا صدام حسین،
تختۂ دار پہ بھی لگتا تھا مردِ آہن
ایسا با حوصلہ کردار تھا صدام حسین

فخرالدین علی احمد

بے سہاروں کا سہارا بے کسوں کی جان تھا
امنِ عالم کا پجاری تھا وطن کی شان تھا
کیا کہوں کیا کیا صفت تھی ایک فخرالدین میں
فخر ملت، فخر انساں، فخر ہندوستان تھا

آشواسن

بے سہاروں اور مظلوموں کی یہ امداد ہے
منچ پر نیتا پدھارے اور بھاشن دے گئے
اور کیا دیں گے بھلا اس ملک کے رہبر ہمیں
بس یہی کافی ہے آکر آشواسن دے گئے

اعزاز

عزت وہ ہے جو بخشے مولائے کریم
قول گداگر کا یہ بالکل سچا ہے
کیا کرنا ہے منہ مانگے اعزازوں کا
بن مانگے اعزاز ملے وہ اچھا ہے

ہنردار

کل بے ہنر تھے آج ہنردار ہوگئے
اجہل بھی علم و فن کے خریدار ہوگئے
پیتے رہے جو مفلس و مجبور کا لہو
وہ بوالہوس بھی صاحب کردار ہوگئے

جھوٹی شان

ہر طرف جھوٹی نمائش اور جھوٹی شان ہے
یہ ہے ہندو، وہ ہے سکھ، وہ صاحب ایمان ہے
ایک پل کو بھی کبھی تینوں نے یہ سوچا نہیں
ہم میں ایسا بھی ہے کوئی، جو فقط انسان ہے؟

قسطوں میں موت

پہلے چلاؤ گولی کرو قتل عام تم
پھر زخمیوں کو دے دو فسادی کا نام تم
کیوں بانٹتے ہو اس طرح قسطوں میں موت کو
اک بار میں ہی کردو یہ قصہ تمام تم

شانتی ہے

کتنے دنوں سے کرفیو نافذ ہے شہر میں
چاقو زنی کا دور ہے نیزے پہ جان ہے
ہے اپنے رہبروں کا یہی ورد صبح و شام
سب شانتی ہے شہر میں امن و امان ہے

مانسون

خشک ہے ساری زمیں اور آسماں خاموش ہے
دوستو کیسا عجب یہ موسم برسات ہے
کیا سبب ہے آج تک آیا نہیں جو مانسون
ہو نہ ہو اس میں بھی کوئی ‘غیر ملکی’ ہاتھ ہے

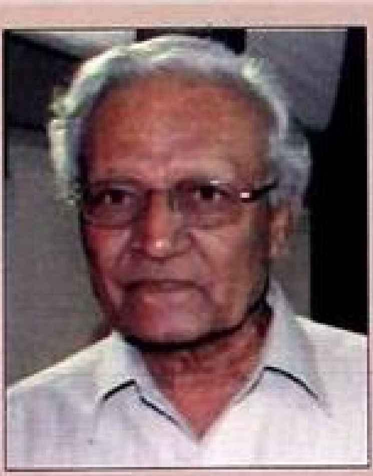

”پرانی دلّی کی چھتنار غزلیہ روایت میں تشکیل پانے والا تخلیقی مزاج، وقار مانوی جیسے ماہرِ فن استاذ سے رموزِ شعر و سخن کی تربیت اور صحافت کو ذریعۂ معاش قرار دے کر دنیا جہان کی خاک چھاننا اور معاشرے، ملّت، قوم و ملک کے نشیب فراز کا وسیع تجربہ، پھر ان سب کو آمیز کرنا اور غزل کا روپ دینا۔۔۔ شعر میں نیا ذائقہ تو آنا ہی تھا۔ افتادِ طبع وہ کہ میر کی طرح پورب کے باسیوں کی قدردانی بھی مزاج پر گراں گذرے، لہجے میں قلندرانہ آہنگ اسی کی دین ہے۔ مجموعہ کلام کا سرنامہ اسم بامسمّٰی ہے۔ میں سلیم صدیقی کے شعری مجموعے ”قلندر بولتا ہے“ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ادبی دنیا میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی“

مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی

(پروفیسر اقبال چیئر)
ڈی، 40 بٹلہ ہاؤس، نئی دھلی

مجھ سے برہم ہے امیرِ شہر پھر
ایسا لگتا ہے کہ اب کے سر گیا

سلیم صدیقی